ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

ڈاکٹر ایشور ٹوپا

انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

(جملہ حقوق محفوظ)

136084

تعداد ایک ہزار
اشاعت ۱۹۶۲ء
قیمت ~~۲ روپیہ ۲۵ نئے پیسے~~

مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ

Marfat.com

فہرست

صفحات

پیش لفظ — پروفیسر محمد مجیب — ۵

پہلا حصّہ

ابتدائی ہندی مسلم تمدنی تعلقات

پہلا باب ۔ عہد وسطیٰ میں ہندی مسلم تمدنی وسیاسی اثرات — ۹

دوسرا حصّہ

ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

دوسرا باب ۔ عربی راج نیتی — ۳۰

تیسرا باب ۔ غزنوی راج نیتی — ۳۵

چوتھا باب ۔ غوری راج نیتی — ۴۱

پانچواں باب ۔ بلبن شاہی — ۴۵

چھٹا باب ۔ کیقباد شاہی — ۴۹

ساتواں باب۔ خلجی شاہی	۵۳
آٹھواں باب۔ تغلق شاہی	۶۱
نواں باب۔ فیروز شاہی	۷۳
دسواں باب۔ ہندوستانی مسلمانی راج کا سرسری جائزہ	۹۰
گیارھواں باب۔ مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی خصوصیات	۱۱۲

پیش لفظ

اس کتاب کا مقصد ہندوستان کے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ اس دور کا ایک سرسری جائزہ لینا ہے بالخصوص وہ مسائل پیشِ نظر رکھے گئے ہیں (مثلاً جزیہ کا مسئلہ) جن کے متعلق لوگوں میں (خاص طور پر ہماری درسی تاریخی کتابوں کے مصنفوں میں) بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔

حالاں کہ یہ کتاب صرف ۱۵۶ صفحات پر مشتمل ہے لیکن مصنف کے وسیع تاریخی مطالعے اور علمیت کا پتہ دیتی ہے۔ فارسی ماخذ بہت احتیاط سے استعمال کیے گئے ہیں۔ مصنف نے بجا طور پر پڑھنے والوں سے قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ سے کچھ واقفیت کی امید رکھی ہے۔ جس کے بغیر اتنا مختصر لکھنا مشکل تھا۔ اگر کسی نے

Marfat.com

اسکول میں ہندوستان کی تاریخ پڑھی ہے تو اسے اس کتاب کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوگی۔

ڈاکٹر ٹوپا کی اس تحقیق کی بنیادی اہمیت یہ ہے کہ یہ ان موجودہ (تاریخی) غلط فہمیوں کا ازالہ کرتی ہے جو برٹش حکومت کے زمانے میں پیدا ہو گئی تھیں۔ اس نقطۂ نظر سے یہ کتاب بہت اہم ہے اور اس سے اچھی کتاب اب تک میری نظر سے نہیں گزری ہے۔

ڈاکٹر ٹوپا ہندو اور مسلم مذاہب کے بارے میں گہری معلومات رکھتے ہیں اور اس سے انھوں نے بہت استفادہ کیا ہے۔ اگر مجھے اس کی اجازت ہو کہ ڈاکٹر ٹوپا نے جس بنیادی بات کو اس کتاب میں پیش کیا ہے اسے ایک جملے میں کہہ سکوں تو وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلم حکمرانوں کی پالیسی سیاسی مصلحتوں سے اثر انداز ہوتی رہی ہے نہ کہ مذہبی اور تبلیغی جذبات سے۔

ضیاء الدین برنی کی کتاب "فتاویٰ جہاں داری" (۱۳۵۷ء) میں جس کا مسودہ حال ہی میں دریافت ہوا ہے اس بات پر اور بھی زیادہ زور دیا گیا ہے۔ برنی لکھتا ہے: "جہاں داری کے ضوابط اور رسول اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے درمیان ابدی تضاد اور تصادم ہے اور ان دونوں میں کبھی یگانگت نہیں ہو سکتی۔"

Marfat.com

اس کتاب کا طرزِ تحریر سادہ اور مؤثر ہے اور پڑھنے والوں کو قائل کر دیتا ہے۔ اس کی اشاعت سے اردو ادب اور تاریخ ہند دونوں کی ایک عظیم خدمت ہو گی۔

(پروفیسر) محمد حبیب
۵ مئی ۱۹۵۹ء

Marfat.com

پہلا باب

عہدِ وسطیٰ میں ہندی مسلم تمدنی وسیاسی اثرات

عام طور سے اس خیال کو اہمیت حاصل ہے کہ شمال مغربی ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق سب سے پہلے جڑتا ہے کیونکہ اسی علاقے سے وہ ہندوستان وارد ہوئے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ تمدنی تجارتی اور علمی میل جول کا سلسلہ جو ہندوستان سے قائم ہوا اس کی ابتدا تقریباً نویں صدی عیسوی کے آخر سے ہوئی اور کئی سو سال تک جاری رہی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی حکومت قایم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانی حکومت کے قیام کے بہت زمانہ پہلے ہندوستان اور مسلمانی ملکوں میں دوستی اور اتحاد کے تعلقات جڑ چکے تھے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔ اس ہندی مسلمانی سلسلہ کی ابتدا دراصل جنوبی ہندوستان سے ہوئی تھی مسلمانوں کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ عربوں کی تجارت چین

Marfat.com

تک پھیلی ہوئی تھی اور تجارتی کاروبار کے سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف علاقوں پر انھوں نے منڈیاں قایم کر لی تھیں اور بعض مرتبہ ساحلوں پر اترتے بھی تھے جس کی وجہ سے ملابار اور لنکا کے مقاموں نے تاریخی حیثیت حاصل کر لی۔

ملابار کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ عرب سوداگروں کے تجارتی بیڑے لنکا کے راستے سے ہوتے ہوئے چین آیا جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ایسے ہی بیڑے میں ایک عجمی درویش بھی تھے جو لنکا کی زیارت کے لئے چلے تھے، مگر سمندر میں طوفان آنے کی وجہ سے ان کو ملابار کے ساحل پر مجبوراً اترنا پڑا۔ ان مسافروں کی بپتا سُن کر ملابار کے راجہ زمورین (ملاباری زبان میں جسے سامری کہتے تھے) نے ان کی آؤ بھگت کی اور ان سے دریافت کیا کہ وہ کہاں کے لوگ ہیں اور ان کا مذہب کیا ہے۔ رخصت کرتے وقت راجا نے ان سے خواہش کی کہ وہ واپسی پر اس کی راجدھانی میں دوبارہ آئیں۔ ان عربوں اور درویشوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور ملابار آئے راجا سامری سے ان کی ملاقات ہوئی اور اس نے ان کے مذہب کے متعلق اچھی خاصی معلومات حاصل کیں۔

ملاباری روایت یہ ہے کہ راجا ان کے مذہب کے اصولوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اس بات کا تصفیہ کیا کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو لے تاکہ اپنی آنکھوں سے خود دیکھ سکے کہ مسلمان جس مذہب کے

Marfat.com

بیرو میں اس کا حال وہاں کیا ہے۔ اپنے راج پاٹ کے کاموں کو اس نے اپنے بیٹوں کے حوالے کر کے ان کے ساتھ ہو لیا۔

اسلام کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب حضرت عمرؓ مسلمانوں کی زندگی کی پرداخت میں نمایاں حصہ لے رہے تھے یعنی اس بات کی جد و جہد کر رہے تھے کہ اسلام کا قانون (قرآن) ان کی زندگی کے لیے ہدایت اور عمل بن سکے۔ راجہ سامری اس خلیفہ کی عملی زندگی سے بے حد متاثر ہوا۔ ملابار کی روایت یہ بھی بتاتی ہے کہ جب دفعتہً راجہ اپنے ملک کو لوٹ رہا تھا تو راستہ میں وہ بیمار ہوا اور بیماری کی حالت میں اس نے ایک فرمان اپنے وزیروں کی ہدایت کے لیے روانہ کیا تاکہ اس کے لوگ اور اس کی حکومت اس شاہی فرمان کی تعمیل کرے۔ اس کی بیماری اتنی بڑھ گئی کہ راستہ میں اس کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی راجدھانی کو واپس نہ ہو سکا۔ حکومت نے اس کے فرمان کی تعمیل کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملابار کی تہذیب اور تمدن میں ایک گہرا انقلاب ہو گیا۔ مسلمان تاجروں اور بزرگوں کو بسنے کی اجازت کے ساتھ ساتھ جو ہمت افزائی کے جذبات سامری کے شاہی فرمان سے ظاہر ہوتے ہیں اس سے ملک میں ترقی کی راہیں کھل پڑیں اور ملابار کی سرزمین پر مسلمانوں کی نئی بستیاں آباد ہو گئیں جس سے ملک میں نئی جان پڑ گئی۔ ملابار کے نو وارد مسلمانوں کو قانون اسلام پر عمل کرنے کی پوری آزادی دی گئی۔ اس نو آبادی کی وجہ سے ملک کی معاشی

Marfat.com

حالت میں بھی نمایاں اضافہ ہونے لگا، خوشحالی بھی نظر آنے لگی تعلقات نے ایک نئے تہذیبی مرکز کی بنا ڈال دی اور مقامی لوگوں پہ مسلمانی زندگی کا اثر پڑنے لگا۔

ملابار نے جو نئے تعلقات مسلمانوں سے پیدا کیے آگے چل کر اس سے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے تہذیبی باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس ملوان تہذیب کی جو ملاباری اور عربی تہذیبی قوتوں سے بنی تھی اس کی نشوونما مسلمانوں سے شادی بیاہ سے ہوئی۔ ملاباری گھروں میں مسلمانی اثرات مختلف طریقے سے ظاہر ہونے لگے اور ملاباری گھر ایک ملوان کلچر کا نمونہ بن گئے جو آج تک ملابار کی سرزمین پر اپنا اثر دکھا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ملابار کی زبان بھی اس کلچری اثر کی ایک زندہ مثال ہے۔ اس تہذیبی میل جول نے سماجی کاموں میں صرف نیا پن ہی پیدا نہیں کیا بلکہ ملک کی اصلی شکل بھی بدل دی۔ یہی وجہ تھی کہ صدیوں تک ملابار ترقی اور دوستی کی قوتوں کا گہوارہ بنا رہا اور ملابار کی زندگی ثمر امن اصولوں پہ کاربند رہی۔ ہندوستانی زندگی کی یہی وہ داغ بیل تھی جس میں مسلمانوں اور ملاباریوں کا آپس کا میل جول امن پسندانہ رہا۔

لنکا کو بھی ہندوستان کی تہذیبی تاریخ میں امتیاز حاصل ہے جو مذہبی لوگوں کے لیے ہمیشہ سے ایک مرکز بنا رہا جہاں جاترا یا زیارت کی خاطر سے لوگ آیا جایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے مختلف مذہبوں کے

Marfat.com

لوگ آباد ہوتے گئے۔ شیومت کے پیرو اور بدھ مت کے ماننے والے لنکا کے باشندے تھے مگر جب مسلمانوں نے چین سے تجارت کا سلسلہ جاری کیا تو اس وقت سے اس دیس میں مسلمان بزرگوں نے آنا جانا شروع کیا۔ اس طرح لنکا مسلمانوں کی عقیدت کا ایک اہم مرکز بن گیا مسلمانوں کی روایت یہ بتاتی ہے کہ لنکا وہ جگہ ہے جہاں حضرت آدم کا نقش قدم موجود ہے۔ اس کو انگریزی زبان میں "ADAM'S PEAK" بھی کہتے ہیں۔ یہ ایک پہاڑی ہے جس کے متعلق بدھ لوگوں کا یقین ہے کہ یہ نقش قدم گوتم بدھ کا ہے اور شیومتی اس کو شیو کا قدم سمجھتا ہے مسلمان، شیو اور بدھ کے ماننے والے اس پہاڑی کی جاترا کرتے تھے اس طرح سے تین تہذیبوں کا سنگم اس پہاڑی پہ ایسا ہوا کہ مسلمان، شیومتی اور بدھ متی آپس میں گھلنے لگے۔ اس مقام پر لنکا کی نئی ملواں تہذیب جنم لیتی ہے اور اس کی تہذیبی زندگی کی خصوصیت میں بڑی نمایاں تبدیلی ہوتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں اکثر ایسا ہوا ہے کہ جب مختلف ملکوں کے لوگ کسی ایک ملک میں بستے ہیں تو اس ملک پہ ایک نیا تہذیبی رنگ چڑھتا ہے اور اس ملک کی عام زندگی بھی کافی متاثر ہوتی ہے۔ اس طرح لنکا کی زندگی میں تبدیلی حضرت آدم کے نقش قدم نے بھی پیدا کی جس طرح ملابار میں ایک ملواں تہذیب ظہور پذیر ہوئی اسی طرح لنکا کی پرانی تہذیب میں نئے اتحادی اور انسانی اثرات بھی رونما ہوئے اور

ایک ملواں تہذیب کا مرکز بنا اور جس نے صدیوں تک اپنی تہذیبی خصوصیت کو بحال رکھا۔

ہندوستان کے دونوں ساحلوں پر زمانہ کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی نوآبادیاں قایم ہوتی رہیں۔ ان آبادیوں کے قیام میں دراصل تہذیبی میل ملاپ کے عناصر اتنے کارگر نہ تھے جتنے کہ مالابار اور لنکا میں۔ لیکن ہندوستان کے ساحلی علاقے مسلمانوں کے تہذیبی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے علاوہ مسلمانوں کے تعلقات ہندستان کے اندرونی علاقوں سے بھی وقتاً فوقتاً ہوتے رہے اور ایسے تعلقات کی بنیاد مسلمانی راج کے قیام سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔ ادھر شمال میں ملتان سے لے کر کشمیر تک کے علاقے اور ادھر کچھ سے لے کر گجرات تک مسلمان پھیلتے جا رہے تھے اور ان کی آؤ بھگت ان علاقوں میں کی جا رہی تھی۔ اکثر ہندی حکومتوں نے مسلمانوں کو آباد ہونے کی بھی دعوت دی تھی۔ اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے ملک میں تجارتی اور صنعتی ترقی ہوئی تھی۔ شہر بسائی کے سلسلہ میں مسلمانوں کو عام مراعات دی گئیں کہ وہ مسجدیں بنا سکتے ہیں اور مذہبی رسومات کو آزادی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں اور اسلامی قانون پر زندگی بسر کرنے کی عام اجازت بھی دی گئی۔ عربوں کی روایت یہ ہے کہ گجرات کا ایک راجا بلہارا نامی گجرات کے عربوں کا بہت ہی ہر دلعزیز راجا گزرا ہے جس نے مسلمانوں کو اپنے ملک میں آباد ہونے دیا اور اپنے دورِ حکومت میں

Marfat.com

جس طرح وہ اپنی رعایا کے ساتھ انصاف سے پیش آتا تھا اسی طرح وہ مسلمانوں کو اپنی رعایا سمجھ کر ان کے ساتھ انصاف برتتا تھا۔ اس کے زمانے میں عام مذہبی بحث مباحثے ہوا کرتے تھے تاکہ لوگ ایک دوسرے کے مذہب کو سمجھیں اور اس طرح ایک مذہب والے دوسرے مذہب والوں سے رواداری، ہمدردی اور محبت کر سکیں اور اپنے آپ کو انسانی رشتہ میں جوڑ سکیں۔ ملتان اور کشمیر کے بیچ کے علاقوں کے متعلق جو دلچسپ شہادتیں ملتی ہیں ان سے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ وہاں کے رہنے والوں نے بھی مسلمانی طرز زندگی کے اصول سے اثر لیا تھا۔ ایک اور روایت یہ ہے کہ ہندوستان میں پہلی مرتبہ قرآن کا ترجمہ ان ہی علاقوں کی ایک ملکی زبان میں ایک راجہ کی سرپرستی میں کرایا گیا تھا۔ مسلمانوں کی ادبی کتابوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کے بعض راجاؤں نے جن کے ناموں کا پتا نہیں چلتا اس بات کی کوشش کی تھی کہ وہ اسلام کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کریں۔ ان میں سے ایسے راجا بھی تھے جنہوں نے اپنے مخبروں کو مسلمانوں کے ملکوں میں بھیجا اور دریافت کیا کہ اسلام کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ روایت یہ بھی بتلاتی ہے کہ ایک راجا نے خلیفۂ وقت کو دعوت نامے بھی بھیجے اور لکھا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پاس اگر کوئی عالم ایسا ہو جو اسلام کے صحیح اصولوں کی وضاحت کر سکے روانہ فرمائیں۔ اسی طرح دوسری روایت یہ بھی ہے کہ

Marfat.com

ایک دوسرے راجا نے اپنے خط میں اس خیال کو ظاہر کیا کہ آیا اسلام محض تلوار کے اصول کا نام ہے یا وہ کسی اور اساسی اصول پہ قائم ہے۔

ہندواسیوں اور مسلمانوں کے مابین جو تعلقات قائم ہوئے ان کی ابتدا ہندوستان میں مسلمانی حکومت کے آغاز سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس طرح اسلام کی اصولی زندگی کا اثر ہندواسیوں کے دلوں میں دلچسپی ہی پیدا نہیں کر رہا تھا بلکہ ان میں ایک شوق اور خواہش بھی اُبھا گر ہو رہی تھی تاکہ وہ واقف ہوں کہ مذہب اسلام کیا ہے اور انسانی ترقی کی راہ میں اس کا نصب العین کہاں تک پورا اترتا ہے۔ ان ابتدائی تعلقات کے دوران میں جس طرح ہندواسیوں نے اسلام کے پیرووں کی آؤ بھگت کی اور ان کو مراعات دینے میں اعلیٰ انسانی جذبہ سے کام لیا اسی طرح نو وارد مسلمان بھی اس قدیم اور مہذب ملک کے حالات سے واقفیت پیدا کرنے میں ہمہ تن مصروف رہے اور ہندوستانی مذہب و ملت کو سمجھنے میں شوق اور دلچسپی کا اظہار کرتے رہے تاکہ اپنی تہذیب کو ہندی تہذیب سے مالامال کریں۔

خلیفہ منصور کے زمانے میں جب مسلمانوں کی زندگی کا مرکز بغداد سے ہٹ کر عراق بنا اور مسلمانی تہذیبی زندگی گونا گوں اثرات سے متاثر ہونے کے بعد اس خیال نے فوقیت حاصل کی کہ ہندوستان بھی

Marfat.com

مسلمانی زندگی کی تشکیل میں نمایاں حصہ لے سکتا ہے تو مسلمانوں نے ہندستان کی طرف توجہ کی جس کی ابتداء دراصل حضرت عثمان کے زمانہ سے ہوئی اور نتیجہ کے طور پر ایک تحقیقاتی وفد ہندوستان بھیجا گیا تاکہ اس ملک کے متعلق معلومات فراہم کی جائیں۔ حضرت عثمان کا خیال ہندستان فتح کرنا تھا لیکن یہ منصوبہ پورا نہ ہوسکا۔ اس خیال نے دوسرے خلیفوں کے عہد میں بھی زور پکڑا کہ ہندوستان کی فتح اگر ممکن ہے تو اس کے لیے کیا تدبیریں کرنی چاہئیں۔ عربوں کی جانب سے جو کوششیں ہندستان کی فتح کے سلسلہ میں ہوئیں وہ تقریباً دو سو سال تک رہیں، لیکن وہ پورے ہندوستان کو فتح کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ صرف سندھ پر ان کا تسلط قایم ہوسکا اور ہندوستان کے سرحدی حصہ پر اپنا قبضہ تھوڑے عرصہ کے لیے کرسکے تھے۔ ہندوستان کی سرحد اس وقت تک سیستان تک پھیلی ہوئی تھی اور وسط ایشیا کے ملکوں پر بھی ہندوستانی تہذیب کا غلبہ تھا۔ عربوں کی تمام کوششیں شمالی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہونے میں ناکام رہیں۔ وہ صرف سندھ کی حد تک کامیاب ہوئے جہاں انھوں نے دو سو سال تک اسلامی اصولوں پر حکومت کی۔ عربوں کی سندھ کی فتح ہندوستان کی فتح سے جو دوسرے مسلمانوں نے کی مختلف تھی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہی ایک علاقہ ہے جہاں اسلامی قانون کے تحت حکومت کی گئی [illegible]۔ وجہ یہ تھی کہ عرب اسلامی روایات اور دستور کے حامل تھے [illegible] ہندستان

Marfat.com

کے ترکی سلطان نو مسلم ہونے کی حیثیت سے اسلامی تاریخ، روایت اور دستور سے بہت دور تھے۔ ان کی زندگی پر جو اثر ہونا چاہیے تھا وہ ایرانی تھا اور ایرانی تخیل، طریقے اور حکومت ان کا شعار تھا۔ عربی اور ترکی حکومتوں میں جو فرق ہندوستان کی سیاسی دنیا میں نظر آیا اس کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ لہذا سندھ میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوتا ہے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں جب مسلمانوں نے حکومت کی تو وہ اسلامی نہ تھی بلکہ ایرانی۔ جہاں جہاں مسلمان حکمرانوں نے اپنی اپنی حکومت کی داغ بیل ڈالی وہاں ایک بھی ایسی تاریخی شہادت نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ اپنی حکومت کا اصول ٹھیٹ اسلامی اصول بنانا چاہتے تھے۔ ان کی حکومت سیاسی رہی اور وہ سیاسی اصولوں کے مدنظر حکومت کرتے رہے گو تمام کے تمام حکمران مسلمان تھے۔ انھوں نے اسلامی شعار کی بجائے سیاسیات یا راج نیتی کو اپنا مسلک قرار دیا جس کی تفصیل اگلے باب میں ہوگی۔

خلیفہ منصور کی سرپرستی میں ایک وفد ہندوستان آیا۔ یہ کوئی تجارتی وفد نہ تھا اور نہ کوئی سیاسی۔ بلکہ تہذیبی تعلقات کے پیدا کرنے کی غرض سے بھیجا گیا تھا۔ اس وفد کی وجہ سے ہندوستان اور اسلامی ملکوں سے ایک نیا تہذیبی تعلق یوں جڑا کہ ہندوستان کی تہذیب کا چرچا اور اس کا پرچار مسلمانوں کے ہاتھوں دنیا میں ہونے لگا۔ مسلمانوں نے ہندوستان سے سیکھا اور سیکھنے کے بعد اس احسان کو ہندی علم اور

Marfat.com

ہنر کو مکمل کر کے اسے دُنیا میں عام کیا۔

ہندواسیوں اور مسلمانوں کی زندگی کا یہ وہ وقت تھا جب ایک ملک علم اور ہنر کے میدان میں اُتر کر دوسرے ملک کے احسان کا بدلہ دیتا ہے تاکہ دنیا انسانی علم سے مستفید ہوسکے۔ اس طرح ہندوستان سے بدھ متی عالموں کا ایک جتھا عراق پہنچتا ہے۔ یہ بدھ متی عالم اپنے ساتھ ہندوستان سے ہر قسم کا بیش بہا لٹریچر لے جاتا ہے خلیفہ نے ان کی آؤ بھگت اس پیمانہ پر کی جیسا کہ سفیروں کی بدیسی ملکوں میں ہوا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ ہندوستان کے عالم سفیر تھے جو اس غرض سے عراق بلائے گئے تھے کہ مسلمانی زندگی کو ہندوستان کی معلومات سے مالا مال کرسکیں۔ خلیفہ نے ان عالموں کی نگرانی کے تحت ایک دارالترجمہ قایم کیا تاکہ ہندوستان کا علم عربی زبان میں منتقل کیا جاسکے۔ اس علمی تحریک کے باعث رفتہ رفتہ ایک جماعت مسلمان عالموں کی پیدا ہوئی جو ہندوستانی بدھ متی استادوں کے شاگرد تھے اور ان میں سے بعض شاگردوں نے ایسی ترقی اور مہارت حاصل کی کہ اپنے استادوں سے بھی بڑھ گئے اور علمی دنیا میں اپنا سکہ جمایا یہی مسلمان شاگرد تھے جنھوں نے بے لوث اور ناقابل فراموش خدمات ہندوستان کے علم کی اشاعت میں کیں۔ اس نامور جماعت کا آخری بے مثل عالم البیرونی تھا۔

ہندوستان سے جو علم بدھ متی عالموں کے ساتھ عراق پہنچا

Marfat.com

تھا وہ مختلف علوم پر مشتمل تھا۔ کتابیں جو زیادہ تر ہندوستان سے گئیں وہ طبی تھیں۔ طبی کتابوں کے ترجمے عربی میں کئے گئے۔ ان میں سے ششرت کی مشہور کتاب جس میں بیماریوں کی علامتیں اور ان کا علاج اور دواؤں کی تفصیل ہے، منکہ پنڈت نے ترجمہ کی۔ برامکہ کے شفا خانہ میں اس کتاب کی حیثیت ایک طبی دستورالعمل کی تھی۔ یحییٰ بن خالد کے حکم سے اس کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

چرک (ہندوستان کا بہت بڑا اور مشہور طبیب) کی کتاب کا ترجمہ پہلے فارسی میں ہوا اور عبداللہ بن علی نے اس کو فارسی سے عربی میں منتقل کیا۔ سد ھانت کا ترجمہ ابن دھن کے ذمہ کیا گیا جو شفا خانہ بغداد کا اعلیٰ افسر تھا۔

دوسری کتاب ندان جس میں چارسو بیماریوں کی صرف پہچان کا ذکر ہے (علاج کا نہیں) ترجمہ کی گئی۔

ایک کتاب جڑی بوٹیوں کی مختلف صفتوں سے متعلق بھی منکہ پنڈت کے ہاتھوں ترجمہ ہوئی۔ اور ایک کتاب کا عربی میں ترجمہ ہوا جس میں دوائیوں کے سرد اور گرم، ان کی قوتوں اور موسموں کی تقسیم کے متعلق ہدایات درج ہیں۔ اسی طرح ایک دوسری کتاب طب پر جس میں بیماریوں کے وہم اور اسباب کا ذکر تھا ترجمہ ہوئی۔ ایک اور کتاب حاملہ عورتوں کے علاج کے متعلق بھی عربی زبان میں منتقل ہوئی۔ ان طبی کتابوں کے ساتھ وہ کتابیں بھی ہندوستان

سے گئی تھیں جن میں جانوروں کے علاج درج تھے۔

ان طبی کتابوں کے علاوہ یہاں سے خالص لٹریچر نجوم، جوتش، رمل، جفر، ہشت ریکھا کا علم (پامسٹری) سانپوں کا علم (سرپ ودّیا کی کتاب ماے نامی پنڈت کی ہے)، موسیقی، فوجی لٹریچر، کہانیاں اور افسانوں کی کتابیں بھی یہاں سے عرب پہنچیں اور ان کے ترجمے خلیفہ منصور نے کرائے جنھیں ان علوم سے بے حد دلچسپی تھی۔ ہندوستان کی موسیقی کے متعلق اسپین کا ایک مورخ قاضی صاعد اندلس جو ۱۰۷۰ھ کا آدمی ہے لکھتا ہے کہ "موسیقی میں ہندستان کی یہ کتاب نافر ہم تک پہنچی ہے جس کے لغوی معنی دانائی کے پھل کے ہیں جس میں راگوں اور سروں کا بیان ہے۔" قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ فارسی کا نوبر (نیا پھل) نام ہوا اور فارسی ترجمے سے عربی میں منتقل کی گئی ہو۔ مہابھارت کے کچھ حصے پہلے فارسی میں منتقل کیے گئے تھے جس کو ابو صالح بن شعیب نے عربی میں ترجمہ کیا۔ سیاست، جنگ اور راج نیتی کی کتابیں جو چانکیہ اور ودیا گھر نے تصنیف کی تھیں عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ چانکیہ کی کتاب کا مضمون لڑائی کا انتظام، بادشاہ کو کیسے آدمیوں کا چناؤ کرنا چاہیے، سواروں کی تربیت، کھانا اور زہر پر مشتمل تھی۔ ودیا گھر کی کتاب تلواروں کی پہچان ان کی خوبیوں اور نشانات سے تعلق رکھتی تھی۔ سنسکرت سے ایک اور کتاب کا ترجمہ عربی میں ہوا۔ اس کا نام "ادب الملک" تھا۔

Marfat.com

یعنی سلطنت کے طریقے بیان کئے گئے تھے۔ اس کا مترجم ابو صالح بن شعیب تھا۔ یہاں تک کہ کیمیا پر بھی ایک کتاب عربی میں منتقل ہوئی۔ اسی طرح علم منطق، کرتب، جادو اور منتر کی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں۔ ہندوستان کی کئی کتابیں جو کہانیوں اور افسانوں کی تھیں ترجمہ ہوئیں جن میں سے سندھ باد حکیم (پنڈت) کی مشہور کتاب تھی۔ ہندوستان کی دوسری مشہور سنسکرت کی کتاب سدھانت جو آریا بھٹ کی تصنیف تھی عربی میں ترجمہ ہوئی۔ کھنڈ اکھنڈ یک بھی عربی میں ترجمہ کی گئی۔

حساب کا علم جو ہندوستان کی ایجاد ہے وہ بھی عربوں کے ہاتھوں میں آیا اور ان کے ذریعہ سے یورپ کو پہنچ سکا۔ عرب میں جو حساب کا طریقہ رائج تھا وہ اصل عدد کا تھا لیکن ہندوستان نے اسے حسابی رقموں میں ۹ تک لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔ صحیح تاریخ کا تعین مشکل ہے کہ عربوں نے ہندوستان کا یہ طریقہ کب سیکھا مگر خیال کیا جاتا ہے کہ ۷۷۳ء میں جب سندھ سے پنڈت گئے تو ان ہی کے ساتھ یہ علم بھی گیا ہوگا۔ جس وقت سدھانت کا ترجمہ ہوا تو اس کتاب میں حساب اور رقم کے باب بھی ترجمہ ہوئے ہوں گے۔ عربی میں پہلے لفظوں میں عدد لکھے جاتے تھے۔ یہودیوں اور یونانیوں کی طرح بعد میں انھوں نے حروف ابجد اختیار کئے محمد بن موسیٰ خوارزمی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا کہ ہندی حساب عربی

136084

Marfat.com

قالب میں ڈھالا گیا۔ اس کے بعد نویں صدی عیسوی کے شروع میں علی بن احمد نسوی نے در اصل مسلمانوں میں اس حساب کو پھیلانے کی انتھک کوشش کی اور ایک کتاب لکھی جس کا نام المقنع فی الحساب الہندی (یعنی ہندی حساب میں خواہش پوری کر دینے والی) ہے۔ اس کو عام طور پر سکھایا جانے لگا۔ نجوم اور ہیئت پر بھی بہت سی کتابیں سے گیا مسلمانوں کی ادبی شہادت اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ ہندوستان کے لوگ عقلمند اور غور و فکر کرنے والے لوگ ہیں اور یہ سب قوموں سے بڑھ کر قوم ہے۔ حساب اور نجوم میں ان کی معلومات سب سے زیادہ درست ہیں بہم معاشرت ان کی زبانت کی پیدا وار ہے جس سے یونانی اور ایرانی دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ علم طب میں ہندوستانیوں کا فیصلہ سب سے آگے ہے منطق اور فلسفہ پر کتابیں ہندوستان میں لکھی گئیں۔ تیسری صدی کے آخر میں ابو زید سیرافی ہندوستان کے پنڈتوں کی اچھی خاصی تعریف کرتا ہے۔ جو بدھ مت پنڈت یہاں سے گئے تھے اور جن کی بڑی عزت مسلمانوں نے کی تھی۔ ان کی تفصیل یہ ہے:-

بھیم، منکہ، بازیگر، فلیوفل، سندباد۔

احیا بن خالد اور برامکہ کے زمانے میں جو طبیب گئے اور جنھوں نے عربی میں طب اور نجوم پر کتابیں ترجمہ کیں ان کے نام یہ ہیں:-

Marfat.com

باکھر، اجا، مسک، داہر، انکو، زشکل، ارسکل، اجھر، عندی اور جیاری۔

ان ہندی عالموں اور طبیبوں نے اپنے مسلمان شاگردوں میں بڑی دلچسپی لی اور ان علم سکھانے میں کسی طرح کا بھی گریز اور تامل نہیں کیا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ ان شاگردوں میں دو عرب شاگرد بے حد مشہور ہوئے۔ ابراہیم فزاری اور یعقوب بن طارق۔ ان ہی شاگردوں کا تحقیقی شوق تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اپنے استادوں کی غلطیاں درست کیں اور ان کی تصنیفوں میں اصلاحیں بھی کیں یہ تحقیقی علمی سلسلہ بغداد سے لے کر اسپین تک تیزی کے ساتھ بڑھتا گیا۔ اس طرح ہندی ودّیا اصلاحی روپ اور نئے رنگ میں مغربی دنیا کو متاثر کرنے لگی مسلمانوں میں جو ایک نئی سائنٹفک اسپرٹ ہندی بدھ متی عالموں کی وجہ سے پھیلی اس کا سلسلہ گیارھویں صدی عیسوی تک بلا روک ٹوک جاری رہا۔ اس علمی، ادبی اور سائنسی تحقیق کے کام میں جن عربوں نے نمایاں حصہ لیا ان کے نام یہ ہیں:۔

حسن بن صباح، احسن بن حبیب، فضل بن حاتم، تبریزی، احمد بن عبداللہ، مرتضیٰ ابن اللہ دمی، عبداللہ اور ابوریحان بیرونی۔

ابوریحان بیرونی یہ گیارھویں صدی کا عالم تھا جو سلطان

Marfat.com

محمود غزنوی کا ہم عصر تھا۔ یہ فلسفی، نجومی، ادیب اور ریاضی داں
گزرا ہے۔ اس کی دھاک اپنے زمانے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ دراصل
اس عربی ہندی تحقیقی سلسلہ کی آخری کڑی تھا جو ہندوستان اور
مسلمانوں کے درمیان سو سال تک قائم رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ
ایک تہذیبی سفیر تھا غلط نہ ہوگا جس نے علمی تحقیق سے اس مسلک کو
حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ ایک ملک والے دوسرے ملک
کے لوگوں کو صحیح معنوں میں سمجھ سکیں اور دوستی کے رشتے کو مضبوط
کرسکیں۔ البیرونی بحیثیت عالم کے مسلمانوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا
کہ ہندوستان ایک مہذب ملک ہے اور علم و ہنر میں ایک اونچی
منزل تک پہنچ چکا ہے۔ اس سے ناواقف اور علحدہ رہ کر دوسرے
ملکوں کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتا اور دوسری طرف اس کی
یہ بھی خواہش تھی کہ ہندوستان مسلمانوں کی تہذیب اور ان کے علوم
سے واقفیت پیدا کرے۔ ان ہی اصولوں پر اس نے اپنی علمی تحقیق اور
کھوج کی بنیاد رکھی۔ اس نے سنسکرت کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں
اور عربی کی کتابوں کا سنسکرت میں کیا۔ اس کی کتابیں اور تصنیفیں
یہ ظاہر کرتی ہیں کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کا سائنس داں تھا اور
اس کی سائنسی ذہنیت کی پرداخت اس طرح ہوئی تھی کہ
آج بھی زمانہ اس کی تعریف ایک استاد کی حیثیت سے کرتا ہے
اصلیت تو یہ ہے کہ اس کی پوری زندگی علم کے کھوج اور اس کے

حاصل کرنے میں عزت ہوئی۔

جس وقت سلطان محمود غزنوی ہندوستان پر حملہ آور ہو رہا تھا اس وقت البیرونی بنارس میں پنڈتوں کی شاگردی میں سنسکرت علم سیکھ رہا تھا۔ اپنے متعلق اس نے لکھا ہے کہ جب وہ علم سیکھنے کی غرض سے ہندوستان آیا تو بنارس کے پنڈتوں سے اپنی خواہش ظاہر کی کہ وہ سنسکرت پڑھنا چاہتا ہے۔ انھوں نے اس کو پڑھانے سے انکار کیا کیونکہ وہ اپنا علم کسی بدیسی کو نہیں دینا چاہتے تھے لیکن البیرونی کی علمی تڑپ اور تحقیقی جستجو سے بنارس کے پنڈت متاثر ہوئے اور اس بدیسی عالم کو اپنی علمی برادری میں لے کر اس کو وہ درجہ دیا جیسی دی جیسی کہ اپنے دیس کے علم کے پیاسے طالب علم کو دی جاتی ہے۔ اس طرح اس نے ہندی علم سیکھا اور آخر میں اس کے استادوں نے اس کو "ودیا ساگر" کا لقب دیا۔ البیرونی نے نجوم، ہیئت، جغرافیہ اور حساب کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھیں۔ اس کی "کتاب الہند" ایک اونچے درجے کی کتاب ہے۔ اس کتاب میں البیرونی نے بحیثیت ایک ادیب کے نہیں بلکہ ایک محقق کے ہندوستان کی سچی تصویر کھینچی ہے جس میں ہندوستان کو ہندی نقطۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے یعنی ہندوستانی اپنے ملک، اپنے مذہب، اپنے رسم و رواج، اپنے علم و ہنر، اپنی ریت، اپنے تہوار، اپنے تعصبوں کے متعلق کس طرح ظاہر کرتے ہیں اور ان کو زندہ رکھنے میں کیا کرتے ہیں۔ البیرونی نے "کتاب الہند" کی تمہید

Marfat.com

میں اس بات کو صاف کر دیا کہ وہ دراصل ہندوستان کا مطالعہ ایک تحقیقی نظر سے کرنا چاہتا ہے۔ ہندوستان کی تہذیب اور اس کے تمدن کا مقابلہ یونانی، ایرانی اور اسلامی تہذیبوں سے بھی کیا ہے۔ اس کو اس مطالعہ میں تہذیبوں کی یکسانیت دکھائی دی اور تضاد بھی جو مختلف ملکوں کے لوگوں میں ہوتا ہے لیکن کہیں بھی اس نے جذبۂ حقارت نفرت اور تعصب کو اپنی تصنیف میں جگہ نہ دی کیونکہ اس کا علمی شعار یہ تھا کہ علم کی تحقیق میں انسان کو سچائی اپنی نظر کے سامنے رکھنی چاہیئے اور جہاں سچائی کی جستجو نہیں وہاں تحقیق نہیں اور جہاں تحقیق نہیں وہاں علم میں صداقت نہیں ہو سکتی۔ اس لحاظ سے البیرونی ہندی اور اسلامی تہذیبی دنیاؤں کا بے مثل سفیر تھا جو ان دونوں کو قریب تر لانے میں، ایک دوسرے کو سمجھنے میں اور خصوصاً ایک ملک کے علوم دوسرے ملک کے علوم سے جو اپنی ملکی حد بندیوں سے آزاد ہیں، سچائی اور تحقیق کی بنیادوں پر قائم کرنے میں اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کرتا رہا ہے بلکہ اپنی بے مثل نظیر کو عالموں کی دنیا کے سامنے پیش کیا اس دنیا کے بغیر جنگ کے علم ہے۔ اس کا غیر متعصبانہ علمی ذہن اور اس کا عمل اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوا جب کہ سلطان محمود غزنوی کا ہندوستان پر حملہ آور ہو رہا تھا اور جس کی وجہ سے ہندوستانیوں کے دل میں نفرت ہی نہیں لگی بلکہ انسانی تعلقات میں بھی فرق آنے لگا تھا۔ لیکن البیرونی نے اپنے آقا کی حمایت اور تعریف نہیں کی۔

Marfat.com

اس کو اس بات کا بے حد رنج تھا کہ سلطان محمود غزنوی کے حملوں سے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی پیدا ہو جائے گی۔

ان کتابوں کے علاوہ ہندوستان کے کھیل بھی مسلمانوں کو پہنچے یعنی شطرنج اور چوسر۔ یہ دونوں کھیل خالص ہندوستان کے دماغوں کی ایجادیں ہیں۔ یعقوبی سیاح مورخ اور عالم جس نے ۲۷۸ھ میں انتقال کیا اپنی ہندوستان کی افسانہ نما تاریخ میں لکھتا ہے کہ شطرنج اور چوسر محض کھیل نہیں ہیں بلکہ حساب اور ہیئت کے نازک مسئلوں پر ان کی بنیادیں رکھی گئی ہیں۔ بظاہر وہ حسابی مسئلوں سے متعلق ہیں لیکن در اصل وہ دو مذہبی یا فلسفیانہ دبستانوں کی تشریح ہیں۔ چوسر کا کھیل یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان دنیا میں جبر کے قانون کے ہاتھوں جکڑا ہوا ہے۔ اس کی قسمت اس کے ہاتھوں سے نہ بنتی ہے اور نہ بگڑتی۔ جو کچھ ہے وہ قسمت اس کو دیتی ہے۔ وہی پھل وہ پاتا ہے، اچھا ہو یا برا، جو اس کے نصیبے کا ہوتا ہے۔ انسان مجبور ہے۔ وہ دنیا کے میدان میں اپنا قدم خود نہیں اٹھاتا۔ اس کا ارادہ اور اس کی نیت اس کی نہیں، بلکہ کوئی بیرونی قوت اس کے پیچھے ہے جو مجبوراً اس کو آگے بڑھاتی یا اٹھاتی یا پیچھے لے جاتی یا گراتی ہے۔ اس کی زندگی مجبوریوں کی ایک زندہ مثال ہے۔ انسان جبر کے قانون کے تحت پیدا ہوا اور اسی قانون کے تحت اپنے دن کاٹ کر موت کے منھ میں جاتا ہے۔ شطرنج کا کھیل جبر کے خلاف اس بات

Marfat.com

کو ثابت کرتا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ بھی ہے وہ انسان کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس کی عقلمندی، اس کی صلاحیت، اس کی تدبیریں، اس کی دور اندیشی، یہ تمام وہ قوتیں ہیں جو زندگی کو کامیاب بناتی ہیں، اس کی ہار جیت کا سوال دراصل اس کی ذہنی اور احساسی قوتوں کے صحیح استعمال پر منحصر ہے۔ انسان کی کامیابی اور ناکامی، اس کے دل اور دماغ، اس کی سمجھ بوجھ، اس کی دوڑ دھوپ کا نتیجہ ہیں۔ الغرض یہ دونوں ہندوستانی کھیل زندگی کے دو پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے لئے ایجاد کئے گئے تھے، تاکہ انسان ان کھیلوں کے ذریعے سے اپنے آپ کو سمجھے۔ یعقوبی کا کہنا ہے کہ ایک پنڈت نے چوسر ایجاد کرکے ایک راجا کو یہ کھیل نذر کیا تھا۔ اسی طرح دوسرے پنڈت نے شطرنج کو ایجاد کیا تاکہ مسئلہ اختیار کھیل کے ذریعہ سمجھا جائے۔ یہ کھیل بھی ایک راج کے لئے ایجاد کیا گیا تھا۔

Marfat.com

دوسرا حصّہ

ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول

دوسرا باب

عربی راج نیتی

Marfat.com

عام ہندوستانی کا یہ خیال ہے کہ ہندوستان میں مسلمانی راج کی ابتدا غزنوی خاندان سے ہوئی لیکن اگر تحقیق کی نظر سے دیکھا جائے تو ہندوستان کی فتح کے سلسلہ میں جو ابتدائی قدم مسلمانوں نے اٹھایا تھا وہ غزنویوں سے بہت پہلے کا ہے۔ ہندوستان کی فتح کا خیال سب سے پہلے دراصل حضرت عمر کی خلافت کے دوران میں پیدا ہوا اور ایک فوجی مہم ہندوستان کے ساحلی علاقوں کی تسخیر کے لئے روانہ بھی کی گئی۔ لیکن خلیفہ وقت کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے فوری احکام جاری کئے کہ ہندوستان سے جہاد نہ کیا جائے۔ حضرت عثمان کے زمانہ میں اس خیال نے دوبارہ زور پکڑا اور ایک دفعہ

ہندوستان کے صوبوں کی کھوج لگانے کی غرض سے بھیجا گیا تاکہ معلومات حاصل کرے لیکن یہ مہم کامیابی کا منہ نہ دیکھ سکی۔ نیز ساتویں صدی سے گیارہویں صدی تک مسلمانوں کی کوشش یہ رہی کہ ہندوستان فتح کیا جائے۔ اس سلسلہ میں ہمیں دو راستوں سے اختیار کی گئیں ایک تو سمندری اور دوسری خشکی کے راستہ سے۔ سمندری مہم دراصل سندھ کی فتح ہے اور عربوں کا راج سندھ میں کوئی سو سال تک رہا۔ جب سندھ فتح کیا جا رہا تھا تو اس وقت سپہ سالار لشکر محمد بن قاسم نے یہ اعلان کیا کہ جو لوگ ہماری امان میں آنا چاہتے ہیں ان سے جنگ نہیں ہوگی اور ان کی جان و مال کی حفاظت ہمارا فرض ہوگا۔ سندھ کے لوگوں نے زندگی کے امن کو فوجی احکام کی تعمیل کر کے حاصل کیا۔ ملک فتح ہو جانے کے بعد سندھ میں اسلامی قانون کا دور دورہ رہا اور سندھی عربی حکومت نے رعایا کے ساتھ اسلامی انصاف اور رواداری برتی۔ تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ عرب حکومت کے ساتھ سندھیوں کو بے حد لگاؤ پیدا ہوا اور رفتہ رفتہ حاکم اور محکوم میں تہذیبی تعلقات کا رشتہ جڑنے لگا۔ سندھ میں اس رشتے کی بنا پر ایک نئی سندھی عربی تہذیب نے جنم لیا۔ نتیجہ کے طور پر یہ بیان کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ سندھی عربی تہذیب ان سماجی طاقتوں کی زندہ مثال ہے جو سندھ میں اپنے تہذیبی سانچوں کے ساتھ عام زندگی کے بڑھاؤ اور پھیلاؤ میں صدیوں

Marfat.com

تک ڈھلتی رہی یعنی سندھی زبان، سندھی رسم و رواج، سندھی عقیدت نیز سندھی زندگی کے مختلف روپ اور پہلو، اس کے حرکات و سکنات عربی اور سندھی اثرات کا نتیجہ ہیں۔

عربوں کی وہ کوشش کہ خشکی کے راستے سے چڑھائی کرتے ہوئے ہندوستان پر قبضہ کریں کئی سو سال تک جاری رہی۔ ہندوستان کی سرحد تک اس زمانہ میں سیستان تک تھی اور اس کی تہذیبی وسعت میں سیستان کا علاقہ بھی شامل تھا۔ عربوں کو سیستان کی مہم میں کافی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا اور آخر میں ان کو کامیابی بھی ہوئی۔ سیستان کی فتح کے بعد عربوں نے اپنے سیاسی منصوبوں کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہ کی بلکہ ان کے قدم بڑھتے بڑھتے کابل تک پہنچ گئے گو اس دوران میں ان کو اکثر شکستیں بھی ہوئیں ممکن تھا کہ اگر عرب حکومت کابل میں استحکام پیدا کر لیتی تو ہندوستان میں وارد ہونا عربوں کے لئے آسان کام ہو جاتا۔ لیکن تھوڑے عرصہ ہی میں کابل کے لوگوں نے اس کو نکال پھینکا اور ان کو اپنا سا منہ لے کر واپس ہونا پڑا۔ اس طرح کابل ہندوستانی اثر کے تحت کچھ عرصہ تک اپنی آزادی کو بحال رکھ سکا۔ دسویں صدی کے وسط میں سامی عملداری میں جو ایشیائے کوچک میں تھی کمزوری پیدا ہونے لگی۔ اس انتشار کے دور میں ان کے ترکی فوجی افسروں نے سر اٹھایا اور چھوٹی چھوٹی حکومتیں سامی پچھتر کے وقار کو تسلیم

Marfat.com

کرتے ہوئے قایم کیں۔ اس طرح غزنی کی حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ غزنوی حکمرانوں کے پر تگین عہد میں ہندوستانی شاہ کابل اور غزنیوں کے درمیان فوجی آزمائش اس وجہ سے ہوئی کہ غزنویوں کے سیاسی اثر اور سنگھٹن کو توڑا جائے۔ اس واقعہ کے متعلق تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہ تصادم ہندو اور مسلمانوں کا دراصل پہلا تصادم تھا۔ اس مٹھ بھیڑ میں غزنویوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ یہ واقعہ اس امر کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستان پر جن حملوں کا سلسلہ محمود غزنوی نے شروع کیا تھا وہ دراصل اسی ابتدائی سیاسی تصادم کا نتیجہ تھے۔ غزنی کے حکمرانوں نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا کہ ان کی حکومت کی بنیادوں میں استواری یا مضبوطی اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکے گی جب تک کہ وہ دولت حاصل نہ کریں اور سرحدی قلعوں پر قبضہ نہ کریں۔ ہندوستان کی سرحد غزنی کی ریاست کی سرحد سے ملی ہوئی تھی اور ان سرحدوں پر بڑے بڑے ہندوستانی قلعے تھے سلطان سبکتگین نے سب سے پہلے یہ کوشش کی کہ وہ ان قلعوں پر قابض ہو جائے۔ اس میں وہ کامیاب ہوا۔ قلعوں پر قبضہ پانے کے بعد اس کا ارادہ کسی دوسرے منصوبے کو پورا کرنے کا تھا۔ یعنی ہندوستان کی دولت حاصل کی جائے۔ یہ منصوبہ اس وقت ممکن نہ تھا جب تک بلوچستان کا علاقہ ان کے قبضے میں نہ آ جائے کیونکہ ہندوستان پر اسی راستہ سے حملہ ہو سکتا تھا۔ اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے

راجہ جے پال نے بلوچستان کے علاقے کی طرف سے خدشہ محسوس کرتے ہوئے سیاست کاری کے جذبے کے تحت یہ علاقے افغانوں اور ترکی قبیلوں کو اس شرط پر عطا کئے کہ وہ ہندوستان کی سرحد کے محافظ بنیں۔ ان قبیلوں نے ہندوستانی سرحد کی حفاظت کی اور سبکتگین کی بڑھتی ہوئی قوت کو اکثر روکا اور اس کا مقابلہ بھی کیا لیکن جب فوجی دباؤ ان پر بہت زیادہ پڑنے لگا اور وہ اس کی تاب نہ لاسکے تو انھوں نے راجہ جے پال کی مدد چاہی۔ راجہ جے پال ان کی کمک کو نہیں آیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کی سرحد کی حفاظت افغانوں اور ترکیوں سے نہ ہوسکی۔ سبکتگین نے "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر عمل کر کے ہندوستان کی سرحدی قوت کو ختم کیا اور ہندوستان میں آنے کا راستہ صاف کیا۔

Marfat.com

تیسرا باب

غزنوی راج نیتی

یوں تو سلطان سبکتگین نے غزنی حکومت کی بنیاد کو مضبوط کیا تھا لیکن اس کی تعمیر اس کے بیٹے سلطان محمود کے ہاتھوں ہوئی۔ سلطان محمود غزنی خاندان کا وہ مشہور حکمراں گزرا ہے جس نے غزنی کو شہرت دوام بخشی۔ سلطان محمود غزنی روایتوں میں پلا تھا اور اپنے باپ کے اولوالعزم سیاسی منصوبوں سے بخوبی واقف تھا۔ یعنی غزنی کی عملداری دریائے اوکسس سے کہیں آگے نکل گئی تھی اور بے جا قاعدہ مندی ہندوستان کی دنیا کے لیے ضروری تصور کی گئی۔ محمود نے اپنے بچپن ہی سے ہندوستان کی دولت سے متعلق قصے اور کہانیاں سنے ہی نہیں تھے بلکہ وہ خوب جانتا تھا کہ غزنی حکومت کے ابتدائی دور میں ہندوستان کی دولت نے کیا کام انجام دیا تھا۔ غزنی حکمراں اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے تھے کہ جب تک غزنی دولتمند ریاست نہیں بنتی اس وقت تک اس کا

Marfat.com

رعب اور دبدبہ قرب و جوار کی اسلامی ریاستوں پر نہیں پڑ سکتا ہے
گیارھویں صدی کی سیاست کاری میں دولت اور سیاست ہم نام
اور ہم اصول شے سمجھے گئے تھے ۔ دولت کے معنی سیاسی اقتدار اعلیٰ
یا یکجہتی کے ہیں اور یکجہتی بغیر دولت کے ممکن نہیں ہے ۔ اسی
سیاسی فضا میں محمود کی تربیت ہوئی تھی نہ کہ اسلامی شعار اور اصول
کے تحت ۔ اس کی ہوس سے متعلق جو قصے بیان کئے جاتے ہیں وہ
دراصل محمود کی اصلی طبیعت اور ذہنیت کو دکھلاتے ہیں ۔ محمود دراصل
تمام غزنی حکمرانوں میں سب سے حریص ترین آدمی تھا اور اس کے
ساتھ ساتھ اس کے دل میں سیاسی طاقت کو بڑھانے کا ایک پُرجوش
ولولہ بھی تھا جو اکثر اوقات اس میں سیلاب کی طرح اٹھتا تھا ۔ لیکن
محمود کی سیاست کاریوں میں جس جذبے نے غلبہ حاصل کیا وہ دولت
کو اکٹھا کرنے کا تھا ۔

محمود نے ہندوستان پر سترہ[۱۷] حملے کئے ۔ یہ حملے مختلف نوعیت کے
تھے کیونکہ ان میں مختلف جذبے کام کر رہے تھے ۔ اگر ان حملوں پر ایک
تحقیقی نظر ڈالی جائے تو محمود کے حملوں کو تین قسموں میں تقسیم کرنا پڑے گا
پہلے قسم کے حملوں کی نوعیت محض سیاسی و فوجی تھی ۔ دوسرے قسم
کے حملوں میں سیاسی یکجہتی کے سلسلے میں انتقامی جذبے تھے ۔ تیسرے
قسم کے حملوں کی نوعیت معاشی تھی ۔ فوجی حملوں میں سیاسی جذبات
کے علاوہ انتقام کا جذبہ کارفرما تھا کیونکہ غزنی اور ہندوستانی ریاستیں

Marfat.com

کے مابین جو سیاسی معاہدے ہوئے تھے ان کی خلاف ورزی کے سلسلے میں محمود نے ہندوستان پر حملے کئے۔ اپنی بالادستی یا چودھری کو تسلیم کرانا اس کا مقصد تھا۔ ہندوستان کے چند راجاؤں نے محمود سے جو معاہدے کئے تھے وہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی توڑ دیئے گئے تھے۔ محمود کے اکثر حملے جذبۂ انتقام کے تحت ہوئے۔ لیکن ان کے وہ حملے جو ہندوستان کی دولت کے لوٹ کے سلسلے میں ہوئے ان کی نوعیت بالکل الگ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہندوستان کی دولت لوٹنا چاہتا تھا جس کے لئے اس نے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ اس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان کی دولت کے خزانے کہاں کہاں صدیوں سے اکٹھے ہیں۔ یہ دولت کے خزانے دراصل ہندوستان کے مندر تھے جن کی لوٹ کھسوٹ آسانی سے ہو سکتی تھی۔ محمود نے جن مندروں کو لوٹا وہ زیادہ تر ایسے مندر تھے جو دولت کے مرکز تھے۔ ویسے تو ہندوستان میں دوسرے اور بھی کئی مندر تھے جن کو محمود اپنی مہم کے دوران مسمار کر سکتا تھا لیکن ان کو ہاتھ نہیں لگایا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس نے دولت لوٹی اور دل کھول کر لوٹی اور اس دولت کی لوٹ کے سلسلے میں مندروں کو مسمار کیا۔ لیکن یہ خیال کرنا کہ وہ اسلام کی خدمت بحیثیت ایک زبردست مبلغ کے کرتا تھا صحیح نہیں ہے۔ محمود اگر واقعی ایک سچے اسلام کا پیرو ہوتا تو اس کی مہموں میں جو اس نے مسلمانی اور ہندوستانی علاقوں

میں اختیار کیں بہت بڑا فرق ہونا ضرور تھا۔ اس نے ہندوستان میں وہی کیا جو اس نے مسلمانی علاقوں میں کیا یعنی بربادی، غارت گری اور لوٹ مار۔ اس کے رویّے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مسلک حکمرانی اور جہانبانی کے اصولوں کو قایم کرنا نہ تھا بلکہ وہ اپنی ریاست غزنی کو مالامال کر کے ممتاز شہنشاہیت کا مرتبہ دلانا چاہتا تھا۔ تاریخ یعطبی میں اس قسم کی شہادت ملتی ہے کہ اس کی مہموں میں خصوصاً ہندوستان کی مہموں میں جو جذبہ کام کر رہا تھا وہ مذہبی نہ تھا بلکہ سیاسی اور معاشی یعنی محمود نے خالص دنیا دارانہ ذہنیت اور جذبے کے تحت مہمیں سرکیں جیساکہ تاریخ میں اکثر دنیادار راجاؤں، مہاراجوں یا سلطانوں کے حالات ملتے ہیں جو محض اپنی ہوس کے پورا کرنے میں طرح طرح کے بے اصولوں اور بے ضابطگیوں سے کام کرتے ہیں۔ ان ہی من مانے حکمرانوں میں محمود کا بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک مہاپرش ضرور تھا۔ اس کی ایک ذہنی ہستی تھی جس نے اپنی دل کی خواہشوں کو من مانی طور سے نہ صرف ایک آمر کی حیثیت سے ہی پورا کیا بلکہ اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ آیا اس کا فعل یا عمل واجبیت کی کسوٹی پر کسا بھی جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس کی تمام کوششوں کا نتیجہ صرف ایک ہی نکلا کہ غزنی کو اس نے ایک امتیازی تہذیبی مرکز بناکر شہرت دی۔ لیکن غزنی کو ایک بڑی عظیم الشان سلطنت میں تبدیل نہ کر سکا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ایک مرتبہ اس کو خیال آیا تھا کہ وہ اپنا راج

ہندوستان میں قائم کرے لیکن اس کو پورا نہ کرسکا۔ محمود کی شخصیت اس اعتبار سے نرالی تھی کہ اس کے منصوبے بہت بڑے تھے، لیکن اس میں وہ صلاحیت اور دوراندیشی نہ تھی جو ایک سیاست داں انسان میں ہونی چاہیے۔ وہ دنیا کا ایک بڑا سپہ سالار ضرور تھا لیکن ایک بڑی شہنشاہیت قایم کرنے کی قوت، نہ رکھتا تھا۔ اس کی نگاہ میں غزنی کا مستقبل اور اس کی ترقی گھوم رہی تھی، نہ کہ ایک عالمگیر سلطنت کا خواب۔

غزنی حکمرانوں کی سیاسی تربیت وسطی ترکی روایات اور ماحول میں ہوئی تھی۔ گو غزنی کے لوگ دسویں صدی کی ابتدا میں مسلمان ہو گئے تھے لیکن ان کی طبیعت، ان کا مذاق، ان کا جذبہ اور ان کی زندگی سب کی سب ترکی تھی لیکن سیاسی نقطۂ نظر میں ایرانیت کا اثر نمایاں تھا۔ کہ اسلامی اصولوں کا ہندی ریاستوں سے جو معاہدے ہوئے تھے ان میں کسی طرح کی اسلامی جھلک اور اسلامی اصول نہ تھے بلکہ وہ اس زمانہ کے عام سیاسی اصول کے تابع تھے۔ محمود کو اگر ایک مبلغ اسلام تصور کیا جا سکتا ہے تو اس کا رویہ اور عمل اسلامی شرع کے مطابق ہونا چاہیے اور اس کی حکومت اسلامی اصولوں پر کاربند ہونی چاہیے تھی لیکن اس قسم کی شہادتیں غزنی کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ اس کے پیش نظر جو اصول ہمیشہ سے رہا وہ سیاست کا دکھاوا یا کارگزاری کا تھا۔ اسی اصول کے تحت اس نے اپنی ریاست کو مضبوط بنایا۔ اس کی فوج اس میں یہی نہیں کہ مسلمان کثرت سے بھرتی کیے جاتے تھے بلکہ غیر مسلم بھی۔ یعنی ہندو

جاٹوں کے جتھے اور پلٹنیں بھی تھیں جو اکثر اوقات مسلمانی علاقوں پر دھاوا بولنے کے لئے بھیجی گئیں۔ ان غیر مسلم پلٹنوں کے علاوہ غزنی فوج میں بڑے بڑے غیر مسلم افسر بھی تھے۔ یہ وہ فوجی افسر تھے جنھوں نے خاندان کے زوال کے آخر وقت تک وفاداری اور جانفشانی کے ساتھ ملک اور مالک کے لیے اپنی اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈالا۔ ان ہی افسروں نے غزنویوں کے آخری دور میں ہندوستان پر حملے کئے۔ جب کبھی فوجی بھرتی کی ضرورت حکومت کو ہوتی تو اس وقت ہندوستان ہی سے فوج بھرتی کی جاتی تھی۔ غزنی خاندان کی ایسی روایات تاریخ میں موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں غزنی خاندان سے دراصل مسلمانی حکمرانی کا ایک سلسلہ شروع ہوا جو رفتہ رفتہ غزنی کے مرکز سے ہٹتا ہوا ہندوستان کو اپنا مرکز قرار دیتا ہے اور صدیوں تک اپنی طاقت کو قایم کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

Marfat.com

چوتھا باب

غوری راج نیتی

غزنویوں کے بعد غوریوں کا دور شروع ہوا۔ یہ غوری بھی غزنی کی سیاسی روایتوں میں پلے تھے۔ ان کے تعلقات ہندوستان سے بالکل فوجی اور سیاسی نوعیت کے تھے۔ غوریوں کی ابتدائی سیاسی زندگی اکثر انقلاب سے گزری جس کی اصل وجہ سیاسی تنظیم اور دولت کی کمی تھی۔ غوریوں کی مہموں میں اکثر فوجی بھرتی کے سلسلے میں کہ "اسلام خطرہ میں ہے" اور "جہاد فرض ہے" کی آوازوں کو اٹھایا گیا تاکہ ہندوستان پر حملے ہو سکیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید ان کو فوجی بھرتی کی مہم میں کامیابی بھی نہ ہوتی کیونکہ فوجی بھرتی کے دوران میں سپاہیوں کو آس دلائی گئی کہ لوٹ مار میں جو دولت غوریوں کے قبضے میں آئے گی وہ اس سے مستفید بھی ہو سکیں گے۔ ان کو دولت کہاں تک ملی اور غوریوں نے ان کو کس حد تک دی تاریخ خاموش ہے

Marfat.com

لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غوریوں کے حملوں میں سیاست کا عنصر بہت ہی نمایاں تھا اور مذہب در اصل ان کی فوجی تنظیم اور مہم کی آڑ تھا۔ یہ شہادت "طبقات ناصری" میں موجود ہے جو اس زمانے کی مستند تاریخ مانی جاتی ہے۔ غوریوں نے بھی غزنویوں کے نقش قدم پر چلنا شروع کیا۔ ہندوستان کے حملوں میں ان کو اکثر شکست اور بعض مرتبہ کامیابی حاصل ہوئی لیکن جو چیز تعجب کی ہے وہ یہ کہ جب دیسی ریاستوں سے ان کے معاہدے ہوئے اور ان کے تعلقات قایم ہوئے وہ اسلامی نہ تھے بلکہ ہندوستانی مروجہ شرائط کے معاہدے تھے یا جو اس زمانے کی دنیا میں عام طور سے رائج تھے یعنی خراج دینا، ایک مختصر تعداد فوجی دستوں کے مرکز کے امان میں رکھنا اور شاہی خاندان کے شہزادوں کو بحیثیت مال غنیمت (HOSTAGES) رکھنا۔ اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ غوری حکمرانوں نے شادی بیاہ کے تعلقات ہندوستانی رجواڑوں سے جوڑے، گو اسلامی معاہدوں کی شرطوں میں اس قسم کے اصول کہیں نہیں ملتے جیسے کہ غوریوں کے ہاں ملیں گے۔

غوری حکومت نے جو سیاسی تعلق ہندوستان سے پیدا کیا اس کو مضبوط تر کرنے میں قطب الدین ایبک کا مقام سب سے اول ہے۔ وہ ایک بڑا سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ تنظیمی صلاحیت کے اعتبار سے ایک مدبر بھی تھا۔ وہ ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمراں ہے جس نے حکومت کا

Marfat.com

مرکز غزنی سے ہٹا کر ہندوستان میں قایم کیا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانی قوت اس بات کے درپے تھی کہ وہ اپنا ایک طاقتور مرکز بنائے لیکن اندرونی کمزوری کے باعث اس کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ غزنویوں سے لے کر غوریوں تک جو "حکمرانی" کا سلسلہ قایم تھا وہ محض فوجی قوت اور تنظیم کا مظاہرہ تھا نہ کہ ایسے سیاسی منظم اصولوں اور اداروں کا جس کی بنا پر حکومت میں استواری اور دیرپائی پیدا ہو۔ فوجی طبقے میں ہم آہنگی کے جذبے کی کمی اور آپس کا رشک وحسد اور راج وسیاست کی بنیادوں کو کمزور کرنے میں مدد دے رہا تھا۔ قطب الدین کو اسی مسئلے سے دوچار ہونا پڑا۔ ممکن یہ بھی تھا کہ اس ابتدائی مسلمان حکمرانی دور میں آپس کی دشمنی اور انفرادی فائدہ مندی کے نتیجہ کے طور پر جو کشمکش ہوتی ہوئی نظر آتی وہ مسلمانی سلطنت کے خاتمہ کے لیئے کافی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ شاہی کا ارادہ جنم نہ لے اور جمہور پسند راج قایم ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ترک افسر قبیلی ہونے کے باوجود جمہور پسند بھی تھے۔ قطب الدین ایبک میں اس قسم کی صلاحیت اور اہلیت نہ تھی کہ وہ ان رجحانوں کا صحیح اندازہ لگا سکے۔ اس کی کوششیں صرف یہ تھیں کہ ہندوستان میں ایک طاقتور سیاسی مرکز قایم ہو جائے۔

قطب الدین ایبک کے بعد شمس الدین التمش کا زمانہ سیاسی رجحانوں کے تضاد کا ایک نازک دور تھا ان پر قابو پانا اس کے امکان

سے باہر تھا۔ سیاسی نفاق کی خلیج کا پاٹنا ایک ایسا اہم اور ضروری کام تھا جس کو وہ پورا نہ کر سکا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس کی تربیت اور ترکی دلدادہ پن اس کے راستے میں حائل تھی۔ وہ صرف اسی بات میں کامیاب ہوا کہ ترکی جماعت کے احساسات اور جذبات کو کہیں ٹھیس نہ لگے۔ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ ایک آمر کی حیثیت سے حکومت کے مسئلوں کی چھان بین کرے لیکن اس کے ترکی جذبات کی مجبوری نے اس کو ایسا کرنے سے روکا۔ حکومت کا فوجی طبقہ جو ترکوں پر مشتمل تھا وہ اپنی اپنی قوت قایم کرنے میں کوشاں تھا تاکہ حکومت ہاتھ میں آئے۔

Marfat.com

پانچواں باب

بلبن شاہی

التمش کے نراجی دور کے بعد غیاث الدین بلبن ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔ بلبن ہی دراصل ہندوستان کا پہلا مسلمان حکمراں ہے جس نے مستحکم شاہی کو قایم کیا۔ وہ فطرتاً ایک آمر تھا اور اس کی آمری قوت ہی کا نتیجہ تھا کہ ملک کی نراجی قوتوں کا سدباب ہو سکا اور مسلمان شاہی جس میں اندر سے گھن لگ رہا تھا بچ سکی۔ بلبن نے اس بات کو بہت جلد محسوس کر لیا کہ مسلمان شاہی اور مسلمان حکمرانی پنپنا ممکن نہیں اگر آپس ہی میں تضاد کی قوتیں ٹکراتی رہیں۔ بلبن کے شاہی نظریہ کا اندازہ تاریخ لکھنے والوں نے غلط طریقہ سے لگایا اور غلط باور بھی کرایا کہ وہ ایک بے رحم آمر تھا جس نے من مانی حکومت کی۔ سیاسی حالات کی مجبوریوں سے وہ دوچار ہو رہا تھا جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ شاہی کے ارادے کو آمریت کی حیثیت ہی سے بچا جا سکتا تھا تاکہ سیاسی تسلط

کا خاتمہ کیا جا سکے۔

بلبن وسطی عہد کا آدمی تھا اور اس زمانہ کی ذہنیت رکھتا تھا۔ اس کا عمل بھی اسی زمانے کے اصولوں اور ترکیبوں سے متاثر ہوا تھا جس رعب اور دبدبہ کی شاہی کا قیام اس کی آمری قوت کی بنا پر عمل میں آیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ایک شاہ تھا جو محض رعب اور دبدبہ کے اصولوں پر حکومت کرنا چاہتا تھا، غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تراج کے زمانے کا توڑ دراصل رعب اور دبدبہ ہی سے ہو سکتا تھا لیکن بلبن نے جو ایک عملی انسان بھی تھا رعب اور دبدبہ والی شاہی کو تہذیبی بنیادوں پر کھڑا کیا اور اسے تہذیب و تمدن سے سنوارا۔ اس نے اکثر اپنے درباریوں کے سامنے اس تہذیبی شاہی مسلک کی تعریف بھی کی تھی۔ اس کے نزدیک شاہی دراصل خدا کا سایہ ہے اور خدا کی دی ہوئی ایک عظیم ذمہ داری بھی ہے جو حاکم وقت پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح وہ حاکم کی بے معنی حرکتوں اور کرتوتوں کی روک تھام کر کے اس کو تہذیب کے راستے پر چلنے کی ہدایت دیتی ہے یعنی شاہی ایک امانت ہے جو خدا کی جانب سے اس بندہ کو دی جاتی ہے جو ایک حاکم کا درجہ رکھتا ہے تاکہ وہ خدا کے احکام پر خود عمل پیرا ہو کر انسانوں کو حکومت کے ذریعہ انصاف اور امن کے اصولوں کا پابند کرائے اور انسانی اصولوں کو جو دراصل خدائی اصول ہیں پیش نظر رکھتے ہوئے حکومت کرے۔ یہ نظریہ بلبن کی شاہی کا تھا، اور عملی انسان ہونے کی حیثیت سے اس نے

Marfat.com

اس نظریہ پر عمل کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ طاقتوروں کی روک تھام، ظالموں کی سرکوبی اور غریبوں کی حفاظت کی گئی۔ اس طرح ملک میں امن قایم کیا گیا تاکہ غریب اور امیر، طاقتور اور کمزور اپنی اپنی زندگی اطمینان سے بسر کر سکیں اور ایک طبقہ اور دوسرے طبقے پہ ظلم و ستم نہ کر سکے۔

بلبن کا زمانہ پُرامن دور سے گزرا جس میں راج کاری اصولوں کا تعلق مذہبی اصول سے نہ تھا۔ تاریخی شہادت یہ بھی بتاتی ہے کہ اس نے مذہب کے دخل کو حکمرانی معاملوں میں آنے ہی نہیں دیا بلکہ اکثر و بیشتر مذہبی اصولوں کو الگ تھلگ رکھا۔ وقت کا تقاضا تھا کہ وہ صرف راج کاری اصولوں کو فروغ دے۔

گو بلبن کی یہ دلی آرزو تھی کہ وہ ان بڑے بڑے "اسلامی سلطانوں" کے اصولوں پہ چلے اور اسلامی حکومت قائم کرے لیکن وہ ایسا نہ کر سکا بلبن ایک اسلامی حکومت کو قایم کرنے میں ناکام رہا۔ اس نے حکمرانی سے متعلق جو اصول اختیار کیے تھے وہ امن و امان کے عام اصول تھے اور جن کا واسطہ اسلامی اصولوں سے بھی ہو سکتا تھا۔ بلبن کی دنیادارانہ پالیسی نے حکومت کی بنیادوں کو ان خدشوں اور خطروں سے بھی دور کیا جو مسلمانی راج کے ابتدائی دور میں تیزی سے اٹھ رہے تھے۔ بلبن کی پالیسی کی کامیابی میں ایک آمر کی چھپی ہوئی ہستی نہ تھی بلکہ اس میں سنگھٹنی صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ یہ صحیح ہے کہ بلبن کے زمانہ میں حکومت کی رہنمائی کے لئے کوئی حکومت دستور نہ تھا بلکہ غیر لکھت قانون ملک میں رائج تھا

Marfat.com

جو صدیوں سے قانون کی شکل میں حکومت کے معاملوں کو طے کیا کرتا ہے
لیکن ملک کی سیاسی حالتیں اور کیفیتیں اکثر اس زمانے کے حکمرانوں کو مجبور
کرتی تھیں کہ وہ ایسے قانون اور قاعدے بنائیں جن کے اثرات کا نتیجہ دراصل
ایک دستور کا ہونا تھا۔ عام طور سے یورپی ملکوں کے متعلق یہ خیال ہے کہ
یورپ میں ہمیشہ سے ایک رحمدل جبریت قایم رہی اور اسی کا دور دورہ
رہا لیکن اگر اس یورپی رحمدل جبریت کی تاریخ پہ ایک گہری نظر ڈالی
جائے تو حالات یہ بتائیں گے کہ اس کا رویہ محض جبر اور بے رحمی پر مبنی
نہ تھا بلکہ زمانہ کے معیاروں کے مطابق جہاں بانی کا بھی پاس اور لحاظ
رکھا گیا تھا۔ اس روشنی میں اگر بلبن کی شاہی کو دیکھا جائے تو اس کا شمار
دنیا کے رحمدل آمروں میں ہو سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلبن ایک
معیاری انسان ہونے کی حیثیت میں ناکام رہا لیکن عملی حکمراں کی حیثیت
سے اس کی شاہی نے وہ کام کیا جو اچھی شاہیاں کیا کرتی ہیں۔

چھٹا باب

کیقبادی شاہی

بلبن کے بعد تھوڑے عرصہ کے لیے کیقباد کی شاہی منظرِ عام پر آئی جو انسانی طاقتوں سے بھرپور تھی۔ تاریخ لکھنے والوں نے صرف اس کی عیش پسندیوں اور اس کے دور کی رنگ رلیوں کا ذکر کیا ہے اس عیش پسند انسان کی شخصیت کے دوسرے رُخ کا حال نہیں لکھا جو انسانی جوہر سے تعلق رکھتا ہے۔ بلبن شاہی ملک پر ضبط، رعب و دبدبہ، ڈر اور ہیبت پیدا کر گئی تھی اس کے خلاف جو ردِعمل تھا وہ دراصل کیقباد کی شاہی تھی تاکہ رعب و دبدبہ کا دور رواداری، انس اور ہمدردی کے دور میں تبدیل ہو جائے۔ اس دور کی خصوصیت ایک نئی تہذیب کا جنم تھا۔ ملک میں امن کے اصولوں کے تحت الوان کلچر اپنی شکل کو نکھارتا ہوا دکھائی دیا۔ یہی وہ ہندوستان کی تاریخ کا زمانہ تھا جب ہندو مسلم اتفاق اور عناصرِ تہذیب کے میلان نئے

Marfat.com

اپنے کمال کو ظاہر کر رہی تھی۔ امیر خسرو اسی زمانے کی ایک بے مثل ہندی مسلم ہستی تھی جس کی جئے جئے کے چرچے ہندوستان میں عام ہیں۔ اس کی نظر میں ہندوستان نعمتوں سے بھرا ہوا ایک جنتی ملک تھا۔ اس کے کلام میں ہندوستانی زندگی کے دلکش خاکے کھینچے ہوئے ملتے ہیں اور پڑھنے والوں پر ان کا اثر ایسا پڑتا ہے کہ وہ امیر خسرو کو ہندوستان کا ایک سچا پریمی مانتے ہیں۔ ہندوستانی (ہندی) زبان کی خوبصورتی، لطافت اور مٹھاس کا ذکر دراصل اسی انسان نے سب سے پہلے کیا تھا۔ اس نے اس میں کویتا بھی کہیں۔ اس لحاظ سے امیر خسرو ایک ہندی مسلم (ہندوستانی) زبان کا بانی سمجھا جا سکتا ہے۔

کیقباد کی زندگی اگر اوپری اعتبار سے جانچی جائے تو رومانی نظر آئے گی، لیکن اس میں ایک انسانی جیتی جاگتی ہستی اپنے اثرات کو سماج اور ملک پر ڈال رہی تھی۔ ایک عشرت پسند حکمراں کے دل میں اس خیال کا آنا کہ کسی کو ایذا یا تکلیف دینا انسانیت کے خلاف جرم ہے، تعجب کی بات ہے۔ کیقباد کی طبیعت میں اسی قسم کے جذبات اٹھا کرتے تھے اور وہ یہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ اور رعایا کی زندگی میں جو فرق ہے وہ اونچ اور نیچ مرتبے کا ہے، لیکن زندگی کی خوشیوں کے اظہار میں بادشاہ اور رعایا برابر کا حق رکھتے ہیں۔ رعایا اپنی خواہشوں اور امنگوں کو زندگی میں اسی طرح پورا کر سکتی ہے جیسے بادشاہ۔ انسانی خوشی کا حق محض بادشاہ کی حد تک

Marfat.com

محدود نہیں بلکہ ہر انسان کو خوش ہونے اور خوش رہنے کا حق حاصل ہے۔ کیقباد نے اپنی رعایا کو اس طرح آزادی دی تھی۔

کیقباد کے زمانے میں بعض سیاسی مسئلوں پر بھی غور و فکر کیا گیا جیسے شاہی اور اس کے فرائض ملک کی خوش حالی اور حکومت کی تنظیم۔ شاہی کے فرائض کے سلسلے میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اپنے نام اور وقار کو تب ہی بحال رکھ سکتی ہے جب کہ اس کی رعایا خوش حال ہو، اس کے تن پہ کپڑا، اس کے جسم میں آن پہنچ رہا ہو اور اس کے رہنے کے لئے مکان ہو۔ جس ملک کے لوگ بھوک اور غریبی سے بے چین ہو کر پریشان ہوں اور بے بسی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوں اس ملک کی شاہی بے کار ہے۔ شاہی کی کامیابی من مانی حرکتوں اور خود غرضی کے رویّہ کو چھوڑنے میں سمجھی گئی تھی۔ انسانی جذبوں سے بھری ہوئی شاہی کبھی وحشیانہ اور جابرانہ طور و طریق کی پابند نہیں ہو سکتی۔ شاہی کے زندہ رہنے کا طریقہ ملک کا مفاد، رعایا پروری اور داد رسی کی اسپرٹ ہے۔ سیاسی مسئلوں کے چھان بین کے سلسلے میں ملک کے مفاد پر یہ روشنی ڈالی گئی کہ ایک خود دار شاہی کو بے بس اور بے دم کرنے کی تدبیریں کیا ہو سکتی ہیں اور یہ بتایا گیا کہ شاہی مشورے اور صلاح کے بغیر اپنے ایک رخی عیب کو دور نہیں کر سکتی۔ اس میں نظر کی گہرائی، ہمدردی کا جذبہ اور جہاں بانی کا خیال تب ہی پیدا ہو سکتا ہے جب کہ وہ حکمرانی کے معاملات میں اپنے جہاں منتریوں

منتریوں اور ملک کے بڑے لوگوں سے مشورہ اور رائے لے. تاریخی شہادت یہ پتہ دیتی ہے کہ اس بحث ومباحثہ کے دوران میں اس خیال پر بھی زور دیا گیا کہ شاہی کسی "دستور" کی پابند ہو تاکہ وہ من مانی طور پر اپنے طرز اور طریق کو اختیار نہ کرسکے۔

Marfat.com

ساتواں باب

خلجی شاہی

کیقباد کی موت کے خاتمے پر خلجی شاہی کا زمانہ شروع ہوا۔ خلجی
خاندان میں خاص صفتوں کے انسان پیدا ہوئے۔ جلال الدین خلجی
ایک انسان پسند حاکم تھا۔ اس کے زمانے میں ریاست کے متعلق اس
قسم کا مسئلہ اٹھا کہ آیا شاہی کی نظر جہانگیری کے سوا اور کچھ بھی ہے۔
جلال الدین خلجی محض ملک گیری کو تنگ نظری کہتا تھا۔ اس نے اپنے
فوجی افسروں کی ایک جماعت سے کہا کہ ان کے جنگی اصولوں کی اہمیت
ان کی زندگی میں ضرور ہے اور جس ملک کے متعلق کچھ کی تمنا
ان کے دل میں ہے وہ اس کا قائل نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے ذہن
سے یہ خیال نکال دینا چاہیے کہ اس کی شاہی سلطان سنجر اور سلطان
محمود جیسی ہے۔ ایسے منصوبے ان کے نہ کبھی معلوم ہوتے ہیں
نہ جلال الدین کے۔ اسی بات پر جب میں اس نے اس خیال کا بھی

اظہار کیا کہ ملک گیری درحاصل انسانوں کی خوں ریزی ہے اور خدا کے بندوں کا خون ناحق بہانا ناجائز ہے۔ ایسے کام ایک شاہ کی ہوس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ملک گیری شاہی کا واحد مقصد ہے تو اس کو ایسی شاہی سے کوئی سروکار نہیں اور وہ بخوشی ایسی شاہی سے سبکدوش ہونا چاہتا ہے۔ اسی سلسلے میں اُس نے یہ بات بھی صاف کر دی کہ وہ ایک سچے مسلمان ہونے کی حیثیت سے بے گناہوں کا خون ملک گیری کی ہوس میں نہیں بہا سکتا اور اسلامی احکام کی رُو سے انصاف اور رحم شاہی کا کام ہے نہ کہ جبر اور ستم۔

جلال شاہی کی خوبی یہ تھی کہ اس میں اہنسا کے خیالات تھے۔ گو جلال الدین کی تمام عمر لڑائی کے میدان میں کٹی تھی لیکن ایک انسان کی حیثیت سے اس نے اپنی طبیعت پر جنگجویانہ اثر نہیں آنے دیا۔ شاہی کا درجہ حاصل ہونے کے بعد بھی وہ انسانی اصولوں پر کاربند تھا جس کو اس نے اسلامی رنگ میں رنگا۔ تلوار کے زور کے بغیر اس کی شاہی انسانی طاقتوں کے بڑھانے میں کامیاب ہوئی۔ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہوئے ہم اس نتیجے پر آتے ہیں کہ اس کے راج میں انسانیت کا اصول بہت ہی نمایاں طور پر نبھتا دکھائی دیا۔ حکومت کے کاروبار انصاف کے بغیر ممکن نہ تھے اور سرکاری افسروں کی مجال نہ تھی کہ وہ رعایا کے معاملات میں غفلت، بے پروائی اور بے اعتنائی برتیں۔ اگر کبھی ایسا ہوا بھی تو ان کو بدنامی کا داغ لگ جاتا تھا۔ اس زمانے کی

Marfat.com

شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی سرکاری افسر اس طرح بدنام ہوجاتا تھا تو اس کو اپنی نوکری مجبوراً چھوڑنی پڑتی تھی اور وہ اپنے کو اس قابل نہ سمجھتا تھا کہ حکومت کے کاروبار انجام دے سکے۔ اگر یہ واقعات صحیح ہیں تو ان سے اس امر کی طرف اشارہ ہوتا ہے کہ عوام کا دباؤ راج پاٹ پر پڑتا تھا اور ان کی رضامندی اور خوشی راج کی پالیسی میں اثر پذیر ہوتی تھی۔

کیقباد کی چلائی ہوئی تحریک کو راج پاٹ کے معاملوں کی انجام دہی میں جلال الدین کے ہاتھوں تقویت پہنچی ہے۔ گو جلال الدین کے زمانے میں استواری اور پائیداری پیدا ہوئی لیکن جلال الدین کی شاہی اسلامی رواداری، اہنسا اور رحم پر مبنی تھی۔ وہ انسانی زندگی کی محافظ تھی۔ لہذا ظلم سے پرہیز اور انسانیت کا درس اس کے دور کی خصوصیت تھی۔ یہاں تک کہ جب سیاسی قیدی اس کے سامنے گرفتار ہو کر لائے جاتے تھے تو وہ ان کو رہا ہی نہیں کرتا بلکہ اپنی نصیحت سے ان میں ایسے جذبات بھی پیدا کرتا تھا جن سے باغی شرم میں ڈوب جاتے اور اپنی حرکتوں پر نادم ہوتے۔ جلال الدین کے ایسے غیر سیاسی طریقہ عمل سے ظاہر ہے کہ وہ سیاسی قانون اور ضابطے کو اتوار سے نہیں گزنتا تھا کیونکہ اس کی نظر میں ظلم، سختی اور بے رحمی شاہی کا شیوہ نہیں ہے۔ اس طرح سیاسی گمراہ انسان بچائے جاسکتے ہیں اور سیاسی گمراہی کی سزا جان کا لینا نہیں بلکہ ان کے ساتھ اہنسا کا سلوک کرکے ان کی

تہذیب کرتا ہے۔

جلال الدین خلجی کے قتل کے بعد علاءالدین گدی پر بیٹھا۔ یہ حاکم سیاسی سمجھ بوجھ کا ایک اچھا ہوا انسان تھا۔ اس نے شاہ بننے کے خواب اپنی ابتدائی زندگی میں دیکھنے شروع کئے تھے۔ جب سے وہ کڑے کا صوبہ دار بنایا گیا تب ہی سے اس کے دل میں شاہی کی امنگیں اٹھیں اس کی ابتدائی فوجی مہمیں شاہی کے راستے کی تلاش کا ایک سلسلہ تھیں ان تمام جنگی مہموں میں اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ دولت حاصل ہونے پر شاہی کا راستہ صاف نظر آنے لگا۔ اس کی نظر میں دولت اور شاہی ایک دوسرے سے بہت ہی قریب کا تعلق رکھتی اور لازم و ملزوم تھیں دوسرے لفظوں میں دولت شاہی ہے اور شاہی دولت۔ دولت کی قوت سے شاہی حاصل نہیں ہوتی بلکہ عوام بھی رام کئے جا سکتے ہیں۔ ہر قسم کی مخالفتیں، فوجی، عوامی اور ملکی اس قوت کے ذریعے سے توڑی جا سکتی ہیں۔ علاءالدین کی زندگی درحقیقت اسی خیال کی ایک انوکھی داستان ہے جو دولت کے جیوت کے تماشوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کی ہر سیاست کاری میں دولت کا کوئی نہ کوئی اثر دکھائی دیتا ہے۔

علاءالدین کو دولت کے بل پر شاہی تخت نصیب ہوا اور دولت نچھاور کر کے عوام کی مخالفت اور دشمنی کو ختم کیا اور خوشنودی بھی حاصل کی۔ علاءالدین کی شاہی راج کے مسئلوں سے دو چار ہونے میں اس طرح کامیاب ہوئی کہ امیری طبقوں کی سازشی قوت کا مقابلہ "دولت کے

Marfat.com

قانون" سے کیا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ امیروں کی دولت ان میں باغیانہ جذبات اور گروہ بندی پیدا کرتی ہے۔ اس لیے دولت کے چھین جانے پر نہ ان میں سکت رہے گی اور نہ جمعیت کہ وہ سازش کر سکیں یا سر اٹھا سکیں۔ راجاؤں سے متعلق زمین اور لگان کے مسئلے علاء الدین کو دق کرنے لگے۔ اس کی سرکار کو اکثر و بیشتر دشواریوں کا سامنا کرنا تھا۔ لگان یا محصول وصول کرنے کے سلسلے میں افسروں کو جب بھیجا جاتا تھا تو جاگیردار اور زمیندار ان کو بے عزت کر کے نکال دیا کرتے تھے جس سے علاء الدین کے راج کی بے قدری ہوتی تھی اور باغیانہ عمل بڑھتا تھا۔ یہاں تک نوبت پہنچی کہ حکومت کے مقابلے میں چھوٹی چھوٹی حریفانہ طاقتیں پیدا ہو گئیں۔ علاء الدین کی پالیسی پر جبر و تشدد کا الزام لگایا جاتا ہے وہ اس زمانے کے ان حالات کی مجبوری کا نتیجہ تھا۔ اگر علاء الدین حکومت کے خلاف اٹھتی ہوئی طاقتوں کا سختی سے مقابلہ نہ کرتا تو اس کا راج رہتا اور نہ اس کی شاہی۔ اس نے خلاف شاہی طاقتوں کے توڑنے کے سلسلے میں جو راج نیتک کارروائیاں کیں ان کا یہ اثر ہوا کہ ملک میں طاقتور اور کمزور اپنے اپنے مقام پر رہے اور ملک میں امن قایم ہوا۔ علاء الدین کی راج نیت سدھار کوششوں کو اسی نقطۂ نظر سے جانچا جا سکتا ہے مثلاً اس کی راتب بندی کی تحریک سیاسی مجبوریوں کا سبب تھی نہ کہ محض معاشی سدھار کا نتیجہ۔ بعض تاریخ کے لکھنے والوں نے علاء الدین کے اس معاشی سدھار

کے متعلق لکھا ہے کہ وہ سماج برابری کے اصول کو رائج کرنا چاہتا تھا. لیکن اصلیت یہ نہ تھی۔ وہ در اصل سیاسی حالات کی مجبوری کی پیداوار تھی کہ ملک پر ایسے قانون سے سماج برابری کا اثر پڑا۔ علاءالدین کی تناہی کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے جو راج نیتک اصولوں پر اچھی خاصی روشنی ڈالتا ہے۔ مذہب اور راج نیتی کے انتر بھید کا زندہ نمونہ علاءالدین تھا۔ اس کی نظر میں مذہب کی دنیا اور راج نیتی (سیاسیات) کی دنیا بالکل الگ الگ تھی۔ مذہب کا سمبندھ انسان کی سماجیک اور معاشی زندگی سے ہے نہ کہ حکومت اور راج سے۔ ان دونوں کو ملانے سے نہ مذہب پنپتا ہے اور نہ راج نیتی ترقی پاتی ہے۔ راج نیتی کا کام حکومت کو صحیح راستے پر چلانا اور مضبوط کرنا ہے۔ راج نیتی پیچھے نہیں، ترقی کی راہ پر لگ سکتا ہے۔ مذہب کا دباؤ اس کے کاموں میں حرج پیدا کرتا ہے اور اس کی آزادی میں رخنہ بھی۔

علاءالدین کے دربار میں عالم اور قاضی موجود رہتے تھے جن پر زیادہ تر دہشت طاری رہتی تھی اور حاکم وقت کے سامنے منہ کھولتے ہوئے ڈرتے تھے۔ ایک مرتبہ علاءالدین نے قاضی مغیث سے دریافت کیا کہ جب وہ فوجی مہم اٹھاتا اور ملک فتح کرتا تو کیا اس کا رویہ اسلام کے قانون کے مطابق ہوتا ہے یا نہیں؟ اور یہ بھی دریافت کیا کہ لوٹ اور غارت گری کے سلسلے میں جو مال اور دولت اس کو ملتی ہے وہ شریعت کی رو سے شاہ کی ملک سمجھی جا سکتی ہے یا نہیں؟ قاضی

Marfat.com

مغیث نے ڈرتے ڈرتے اور عرض کیا کہ اگر حضور جاں بخشی فرمائیں تو شریعت کا فیصلہ سنانے کی جرأت کرے۔ علاء الدین نے جاں بخشی کا حکم دیتے ہوئے کہا کہ قاضی نڈر ہو کر اسلام کے قانون کی وضاحت کرے۔ قاضی مغیث نے شریعت کی رو سے یہ بیان کیا کہ حضور کا یہ رویہ اور عمل اسلام کے قانون کے خلاف ہے کیونکہ جب اسلام کا لشکر مال غنیمت لے کر واپس آتا ہے تو حاکم صرف ایک چوتھائی حصہ کا حقدار ہوتا ہے اور باقی تین چوتھائی حصہ فوج میں تقسیم ہوتا ہے۔ حضور تمام غنائم بیت المال میں داخل کر دیتے ہیں جو شریعت کے خلاف ہے۔ یہ سن کر علاء الدین نے بڑے زور سے قہقہہ لگایا اور کہا کہ قاضی تو ایک عالم ہے جس نے شریعت کے متعلق کتابیں پڑھی ہیں لیکن راج پاٹ کے معاملوں سے ناواقف معلوم ہوتا ہے۔ علاء الدین نے اس بات کا اعتراف کیا کہ وہ عالم نہیں ہے اور نہ وہ اسلام کے قانون سے واقف ہے لیکن حکمرانی کے قانون کو سمجھتا اور جانتا ہے۔ اس نے کہا کہ اگر ہندوستان میں شریعت کی رو سے حکومت کی جائے تو ہندو اور مسلمان کبھی سیدھے نہ رہ سکتے۔ ہر روز بغاوتیں ہوتیں اور حکومت کے خلاف سازشیں کی جاتیں۔ وہ جو کچھ کرتا ہے اس میں مصلحت اور حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اس کو یقین تھا کہ ہندو مسلمانوں کے فتنے اور کسی طریقے سے دور نہیں کیے جا سکتے سوائے سیاسی تدبیروں کے۔ آخر میں اس نے کہا کہ اس کے

پیش نظر جو مسلک ہے وہ ملک اور لوگوں کی بھلائی ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ تمام کام انجام دیتا ہے۔

کیقباد کے زمانے سے ہندوستان میں ہندو مسلم کلچر کی میل جول نظر آرہا تھا۔ اس تحریک کو خلجی عہد میں بھی فروغ حاصل ہوا شاہی درباروں اور سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھتا گیا۔ شاہی محلوں میں بھی اس قسم کے اثرات شدت سے رونما ہونے لگے۔ آپس کی دوستی اور رواداری اور بھائی بندی کی ابتدا اسی زمانے سے ہوتی ہے۔ علاؤالدین کے بعد حکومت کی باگ ڈور مبارک شاہ کے ہاتھ میں آئی۔ اس کے دور میں خصوصاً ہندوؤں کا غلبہ شاہی انقلاب کا باعث بنا۔ مبارک شاہ کی تخت نشینی میں ملکی ہندو عنصر کام کرتا دکھائی دیا گو اس کے راج کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے سوائے اس کے ہندو اثر راج نیتی پہ پڑا تھا۔

Marfat.com

آٹھواں باب

تغلق شاہی

خلجی خاندان کے خاتمے پر تغلق شاہی قائم ہوئی۔ تغلق حکمراں تمدنی اور کلچری مسلکوں کے حامل تھے۔ غیاث الدین تغلق کی شاہی کے حکومتی انتظام کے ذریعہ ملک میں امن وامان قائم ہوا اور عام فضا میں درستی ہوئی۔ اس نے شاہی میں ایک بہت بڑی ذمہ داری محسوس کی تھی جو روشن خیالی، عقلمندی اور دور نظری کے بغیر پوری ہونی مشکل ہے۔ شاہ کو محض ایک محافظ کی حیثیت سے دیکھنا راج پاٹ کے کاموں کو ادھورا رکھنا ہوگا۔ رعایا کا امن اور چین شاہی قابلیت، ہمدردی اور انصاف کا محتاج ہے۔

جلال الدین کی طبیعت میں انصاف پسندی کے علاوہ حکومت کو بہتر بنانے کی خواہش بھی تھی۔ اس کی شاہی کا محرک طاقتور اور کمزور کے مابین انصاف اور رواداری کے اصول قائم کرنا تھا۔ وہ جنگجویانہ مسلک

Marfat.com

کا قائل نہ تھا گو اس کی فوجی کارروائیاں زمانے کی مجبوریاں تھیں بھلائی اور بہتری کے مدنظر سرکاری افسروں کی چوکسی اور نگرانی کی تاکہ ظلم اور ناانصافی کی روک تھام ہو۔ غیاث الدین تغلق کی "روشن خیالی" اس کے حکومتی انتظام کے اصولوں میں نظر آتی ہے۔

غیاث الدین کے بعد اس کا بیٹا محمد تغلق گدی پہ بیٹھا۔ وہ دنیا کی ایک عجوبہ ہستی تھی۔ اپنے زمانے کا مانا ہوا ادیب، حساب داں منطقی اور دلکش بات چیت انسان تھا۔ اس کے من میں جدت پسندی کی اُمنگیں اٹھا کرتی تھیں اور اس کا خیال اور نظریے ان سے متاثر بھی ہوئے تھے گو زمانے نے اس کو جنم دیا تھا لیکن وہ اپنے زمانے کا آدمی نہ تھا۔ اس کی نظریں آنے والے زمانے کی طرف اشارہ کرتی تھیں۔ اس کی کوشش انسانوں اور اداروں کو نئے ڈھنگ اور نئی ریت سے چلانے کی تھی لیکن اس کی جدت پسندیاں نہ اس زمانے کے مطابق تھیں اور نہ ان کو انسان کی جانب سے داد ملی۔ تاریخ میں محمد تغلق کے انوکھے طریقوں کو بیجا طور سے اچھالا گیا ہے جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کی جدت پسند انہ ہستی کا صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دلی کے تخت پہ شاید کبھی کوئی ایسا جدت پسند حکمراں بیٹھا ہو جیسے کہ محمد تغلق تھا۔ جس کی شاہی نئے خیالوں اور نئی روشوں سے بھرپور تھی۔ وہ ان کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ اس کی بدبختی یہ تھی کہ وہ ایسے زمانے میں پیدا ہوا جس پر انتہائی قدامت پرستی

Marfat.com

چھائی ہوئی تھی۔ محمد تغلق نے اپنے راج کے دوران میں شاہی کے تہذیبی مسلک کو اس غرض سے پیش کیا تھا کہ وہ ملک کی فضا اور لوگوں کی زندگی میں ایک گہری تبدیلی پیدا کرے۔ اس کے سکون پیدا کر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد رعایا میں وفاداری کے جذبہ کو پھیلانا تھا تاکہ عام زندگی میں وفادارانہ اظہار ہو سکے۔ اور شاہ اور جنتا میں اتحاد اور دوستی کے رشتے کی نئی بنیاد پڑے اس طرح راج میں پائیداری اور استواری قائم ہو سکتی ہے۔

محمد تغلق کی زندگی میں مایوسیاں زیادہ تر مختلف طبقوں کے باغیانہ طرز کا نتیجہ تھیں۔ اس کا غضب حدبندیاں توڑ کر اس وقت دکھائی دیتا تھا جب کہ اس کی مہربانیوں، عنایتوں، رحم دلی اور رواداری سے فائدہ اٹھا کر سازشی اور باغی بے جا حرکت میں مبتلا ہوتے تھے۔ یہ اس کی شومی قسمت تھی کہ اس نے جن جن لوگوں اور طبقوں کے ساتھ نیک سلوک اور اچھا برتاؤ کیا انھوں نے ہی اس کو دھوکا دیا۔ محمد تغلق کی طبیعت میں عوام پسندی کا جذبہ بھی تھا۔ عام انسانی جوہر کی بربادی کے نظاہرے اس کی نگاہ میں گھوما کرتے تھے۔ اس کو اس بات کا خیال ہوا کہ سماج کے دبے ہوئے انسانوں کو اٹھایا جائے۔ اس زمانے میں اور عام طور سے بھی آمر طبقہ (ارسٹوکراسی) یہ سمجھتا ہے کہ انسانی جوہر صرف اعلیٰ سوسائٹی کے افراد میں ہی ملتے ہیں اور اس طبقے میں پیدا ان پنپتے ہیں۔ اور یہی تہذیبی ورثہ مخصوص انسانوں کا ہے۔ لیکن محمد تغلق

Marfat.com

کا خیال تھا کہ انسانی جوہر ہر انسان میں موجود ہے خواہ وہ اعلیٰ یا ادنیٰ طبقے کا انسان کیوں نہ ہو۔ اس انسانی جوہر کی پرداخت اور نگہبانی کو وہ اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اس نے اپنے دور حکومت میں سماج کے گرے ہوئے طبقوں کی سرپرستی کی۔ ایسے طبقے کے لوگوں میں جب اس نے انسانی جوہر دیکھے تو ان کو اونچی پدویاں دیں۔ صلاحیت اور قابلیت کی بنا پر ان کو مرتبہ نصیب ہوا۔ لیکن اس زمانے کی ارسٹوکریسی نے محمد تغلق کے اس رویّہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا اور اس کو بدنام بھی کیا کہ وہ ارسٹوکریسی کا دشمن ہے اور ادنیٰ انسانوں کا سرپرست لیکن جس خیال نے اس شاہی ہستی کو متاثر کیا تھا وہ سماج کے مقررہ اونچ اور نیچ کے اصول نہ تھے بلکہ انسانی کمال اور جوہر کی جانچ کے اصول تھے۔ محمد تغلق کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اس جذبے نے بھی کام کیا۔ اس نے اعلیٰ سماج کے انسانوں کی عزت اس وجہ سے نہیں کی کہ وہ اعلیٰ سماج کے انسان ہیں بلکہ وہ انسانیت کے اچھے نمونے میں یہی اس کا شعار تھا۔ محمد تغلق کی طبیعت کا دوسرا پہلو بدیسیوں سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ ہے۔ ہندوستان کے حاکموں میں سے یہ پہلا انسان تھا جس کو بدیسی بے حد عزیز تھے۔ سیّاح پرچی کی حیثیت سے اس نے ان کی آؤ بھگت کی، ان کو ملازمتیں دیں، ان کو اعلیٰ مرتبے دیئے اور ان کو طرح طرح کی مراعات بخشیں۔ اس بدیس پرستی کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک میں بدیسی بڑی تعداد میں آئے لیکن

Marfat.com

ان کی آمد سے ہندوستانی سماج پر اچھا اثر نہیں پڑا۔ ایک طرف ہندوؤں کے دلوں میں ان کے خلاف آگ بھڑکنے لگی۔ حکومت کے خلاف جو سازشیں ہوئیں ان میں اس جذبۂ نفرت نے بھی کام کیا اور نتیجہ یہ کہ ان باغیوں نے محمد تغلق کا ناک میں دم کر دیا۔ اس سے حکومت کا شیرازہ کانپ اٹھا۔ بد امنی اور طوائف الملوکی سے ملک میں بغاوت پھیلنے لگی اور عام بے چینی کے آثار نمودار ہوئے۔

ملکوں کی فتح اور ان پر قبضہ یعنی جہانگیری مہم محمد تغلق کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس نے ملک فتح کر کے سلطنت کے حدود بڑھائے لیکن دلی کی راجدھانی کو مرکز بنا کر وہ اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ایسی نئی راجدھانی بنائی جائے جو ملک کے تمام حصوں کا مرکز ہو۔ اسی خیال نے محمد تغلق کو دلی کا شہر اجاڑنے پر آمادہ کیا۔ اس تجویز کے تحت اس نے راجدھانی کی تبدیلی کا حکم صادر کیا۔ سلطنت کے حصوں کے لیے فاصلہ غلط نہ تھی اور نہ یہ تجویز غلط تھی۔ دلی کی راجدھانی دولت آباد (دکن) میں منتقل ہوئی لیکن دلی کو اجاڑنے اور دولت آباد کو بسانے کے سلسلے میں جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ دانشمندانہ قدم نہ تھا۔ گو اس نے راجدھانی کے تبادلے کے سلسلے میں ہر ممکن انتظام کر کے تبادلہ مختلف منزلوں میں ہوا تھا تاکہ دلی والوں کو راستے میں کھانے پینے اور رہنے کی تکلیف نہ ہو۔ تمام خرچے کا بوجھ حکومت کی جانب سے اٹھایا گیا۔ لیکن نہ دولت آباد بن سکا اور نہ اجڑی ہوئی دلی پھر سے

Marfat.com

آباد ہو سکی۔

محمد تغلق کی شاہی کے تجربے اس کی خصوصیت تھے نئی باتیں نئے خیال، نئے طریقے اور نئے قاعدے کو رواج دینے کی اس کے دل میں تمنا تھی۔ اس نے راج پاٹ کے معاملات میں بھی جدت پسندی دکھائی مثال کے طور پر نئے سکہ کا رائج کرنا جو سیاسی اور معاشی اصولوں کے تحت ایک ٹھیک قدم تھا۔ دوسرے ملکوں نے بھی اس طرح کے تجربے کئے تھے اور وہ کامیاب بھی ہوئے تھے لیکن محمد تغلق کے زمانہ میں یہ تجربہ ناکام رہا۔ اس کی ناکامی کی وجہ اصول کی غلطی نہ تھی بلکہ لوگوں کی غیر دانشمندی اور بے اعتمادی تھی۔ طبقات اکبری میں اس نئے سکے کی اجرائی کے سلسلے میں محمد تغلق کی سیاسی دور اندیشی اور سمجھ بوجھ کو اس خیال کے تحت سراہا گیا کہ وہ سونا محفوظ کرکے اپنے سیاسی منصوبوں کو آسانی سے پورا کرے۔

اس طرح محمد تغلق کا ہمدردانہ رویہ جو جغتائی منگولوں یعنی ان کی مصیبت زدہ گروہ کے سلسلے میں اختیار کیا وہ بھی تلخی، مایوسی اور رنج میں بدل گیا۔ قحط سالی کے زمانے میں شاہی رویہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رعایا پروری کے جذبے میں پوری طرح ڈوبا ہوا تھا اور اس کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنی رعایا کے آڑے وقت میں کام آسکے لیکن اس کی بے وفائی، بد زبانی، مکر و فریب اور خود غرضی کی وجہ سے ملوک رعایا کو وہ راحت، اطمینان نصیب نہ ہو سکا اور وہ امن اور حفاظت حاصل نہ ہو سکی جو قحط سالی کے وقت [illegible]

کو حکومت کی جانب سے حاصل ہونا چاہئے تھی۔ اس میں محمد تغلق کا قصور نہ تھا اس کے زمانے نے اس کا ساتھ نہ دیا۔ یہی اس کی بدبختی تھی۔

محمد تغلق ایک غیر معمولی ذکیائی آدمی تھا۔ وہ سیاسی امور میں محو رہتا اور رواج یافتہ کے مفاد کو [illegible] اپنا مفاد سمجھتا تھا اور [illegible] اس سے بحیثیت ایک انسان اور بادشاہ کے ہو [illegible] اس نے کیا [illegible] یہ خواہش تھی کہ اس کے بادشاہ [illegible] ریاست کی آزادی [illegible] عظیم اور اعلیٰ معلوم ہونے لگا [illegible] ریاست کا [illegible] ہو جائے گا۔ [illegible] اس نے [illegible] مانی مگر اس بات [illegible] طاقتوں پر حاوی ہو [illegible] اقتصادی [illegible] تک سیاسی [illegible] کو [illegible]

[illegible]

نے ایسے حالات میں کیا سزائیں نہیں دیں؟ ضیاء الدین برنی نے ادب سے جواب دیا کہ میں نے شاہی تاریخوں کا مطالعہ کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ سزا کے بغیر اپنی حکومت نہیں چلا سکتا اور اگر وہ اس قسم کی سزائیں نہ دے تو خدا ہی جانے کہ بدطن لوگوں کی جانب سے کتنی مصیبتیں آئیں اور ہزاروں جرم رعایا کی جانب سے سرزد ہوں۔ جمشید سے دریافت کیا گیا تھا کہ سزائیں کن حالتوں میں واجب ہیں اس نے جواب میں کہا کہ سات حالتوں میں مثلاً ترک مذہب، ارادتاً قتل، شادی شدہ عورت سے زناکاری، بادشاہ کے خلاف سازش، باغیوں کی امداد یا بغاوت کرنا، دشمنوں یا بادشاہ کے دشمنوں سے ملنا، قانون یا مملکت کی خلاف ورزی۔ ان وجوہ کے علاوہ کوئی انسان ملک میں گڑبڑ پیدا کرے یا تکلیف دے یا ملک کو نقصان پہنچائے یا سازشیں کرے وہ بھی سزا کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو بادشاہ کے قانون یا حاکم کو نہیں مانتا وہ خدا کے حکم کو بھی نہیں مانتا کیونکہ بادشاہ خدا کا نائب ہے۔ اگر بادشاہ سزائیں نہ دے تو حکومت میں تاراج پیدا ہو جائے گا۔ محمد تغلق کو ضیاء الدین برنی کا جواب سن کر اطمینان نہ ہوا کیونکہ جو کچھ بھی برنی نے کہا وہ اس نے اپنے آقا کے خیال کی تصدیق کی تھی۔ اس نے ضیاء الدین برنی سے پھر دریافت کیا کہ اس کا رویہ کیا شریعت کے بموجب ہے[1]

۱۔ محمد تغلق کے اس سوال سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنا راج شریعت پر قائم نہیں کیا تھا۔

Marfat.com

[illegible]

... زمانے میں بدمعاشوں ... لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں
ان کو یہ سمجھ کر سزائیں دیتا ہوں کہ وہ باغیانہ اور مفسدانہ حرکت سے
باز آئیں لیکن وہ نہیں مانتے۔ اس وجہ سے ان میں اکثر موت کے گھاٹ
اتار دیئے جاتے ہیں۔ میں اس وقت تک ایسا ہی کرتا رہوں گا جب تک
کہ میری جان میں جان ہے۔ اس لئے لوگ جو آگے اپنے رویے کو بدل
دیں اور بغاوت اور سازش کرنا چھوڑ دیں میرے یہاں ایسے وزیر نہیں
جو ایسے قاعدے بنائیں تاکہ خونریزی کم ہو سکے۔ میں لوگوں کو سزائیں دیتا

ہوں کیونکہ وہ سب کے سب میرے مخالف اور دشمن ہو گئے ہیں۔
میں نے بے انتہا دولت ان کو دی لیکن وہ میرے دوست نہ بن
سکے اور نہ میرے وفادار۔ میں ان کی طبیعت سے خوب واقف ہوں
اور دیکھ رہا ہوں کہ وہ مجھ سے بدظن ہیں اور مجھ سے دشمنی برتتے ہیں میری
حکومت کی حالت ایک مریض کی سی ہے جس پر کوئی دوا اثر نہیں کرتی
اور کوئی علاج اس کو تندرست نہیں کر سکتا۔ طبیب اگر درد سر کا
علاج کرتا ہے اور شفا پہنچاتا ہے تو بخار پیدا ہو جاتا ہے اور اگر بخار
کو دور کرتا ہے تو کوئی دوسری بیماری ظاہر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح
میری حکومت میں بغاوتیں ہو رہی ہیں میں ایک جگہ سے اس
کو دباتا ہوں تو وہ دوسری جگہ سے نکل پڑتی ہے۔ ضیاء الدین برنی
نے بادشاہ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا کہ جب بعض بادشاہ ایسا
محسوس کرتے ہیں کہ وہ اپنی رعایا میں اعتماد نہیں پیدا کر سکتے اور تمام
نفرتوں کا مرکز بن جاتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ تخت چھوڑ دیں اور
اپنے لڑکوں میں سے کسی ایک لائق ترین لڑکے کو گدی پر بٹھا کر خود
گوشہ نشینی اختیار کریں اور اپنے مذہبی کاموں میں لگ جائیں جس سے
ان کی زندگی کے آخری دن سرکاری کام کی دیکھ بھال کی ذمہ داریوں
سے آزاد ہو کر چین سے کٹ سکیں۔ بعض بادشاہوں نے ایسے
حالات میں یہ کیا کہ شکار کھیلنا، عشرت پسندی اور شراب نوشی کو
اپنی زندگی کا شیوہ بنا لیا اور حکومت کے تمام معاملات وزیروں اور

Marfat.com

افسروں کو سونپ دیئے۔ اس طرح سے رعایا میں خوشنودی کے جذبہ کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ بادشاہ کا غضب دور ہو جاتا ہے اور ریاست تمام بیماریوں سے آزاد ہو جاتی ہے۔ تمام ان بیماریوں میں سے سب بڑی اور مہلک بیماری جس کا شکار جذبۂ نفرت اور عدم اعتماد سے محمد تغلق نے ضیاء الدین برنی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کے جب [illegible] [illegible] ہو جاتے۔

[illegible] وہ [illegible] رعایا سے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کوئی فائدہ [illegible] [illegible] [illegible] تلوار ہے۔ وہ تلوار سے کام لیتا ہے اور سزائیں بھی دیتا ہے تاکہ مصیبت [illegible] کہ لوگ اپنے [illegible] [illegible] سکیں۔ رعایا جتنی مخالفت کرنی چاہے تو اتنی ہی وہ سزائیں دیتا رہے گا۔ محمد تغلق نے آخر دم تک اپنے رویہ میں تبدیلی نہیں کی کیونکہ رعایا کی طبیعت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس نے رعایا کے لڑائی کے دعوی کو قبول

Marfat.com

کیا اور ایک حاکم کی حیثیت سے لڑا۔ اس کا عہد دراصل شاہی کے منصوبوں اور سیاسی طاقتوں کے ٹکر کی ایک نظیر تھی۔ وہ زمانہ کی جہالت کا شکار رہا۔

محمد تغلق کے انتقال کے بعد حکومت کے سامنے یہ سوال تھا کہ اس کا جانشین کون ہے کیونکہ اس کا کوئی لڑکا نہ تھا جو گدی پر بیٹھتا ملک کو سیاسی تباہی سے بچانے کی خاطر اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ کسی ایک اہل ترین شخص کا انتخاب کیا جائے جو شاہ کے فرائض انجام دے سکے۔ امراء اور سرکاری اعلیٰ افسروں کے غور و فکر کے بعد تصفیہ ہوا کہ فیروز شاہ تغلق کا چناؤ کیا جائے جو اس کے بھائی کا لڑکا تھا۔ فیروز شاہ کے چناؤ میں ہر دلعزیزی کا عنصر غالب تھا۔ اس چناؤ میں علماء کے طبقہ کا بھی بہت بڑا دخل تھا گو فیروز شاہ تخت پر نہیں بیٹھنا چاہتا تھا۔

Marfat.com

نواں باب

فیروز شاہی دور

فیروز شاہ کی سیاسی تربیت غیاث الدین تغلق اور محمد تغلق کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ محمد تغلق نے خصوصاً یہ سمجھ کر کہ فیروز شاہ اس کا جانشین بننے کی صلاحیت رکھتا ہے اس کو عملی راج پاٹ کا سبق دے دیا تھا۔ فیروز شاہ تغلق محمد تغلق کو اپنا آقا، اپنا استاد اور اپنا بھائی سمجھتا تھا۔ گو وہ تغلقی اسکول میں پلا تھا لیکن اس کی نظر ایک دوسری تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں سے دونوں راجاؤں کی خوبی اور برائی دیکھی تھی اور وہ اپنی تجربہ کاری کی بنا پر اس نتیجہ پر پہنچا کہ راج کو کن چیزوں کی ضرورت ہے۔ اسے اس بات کا بھی احساس پیدا ہوا کہ تلوار کی طاقت راج کے عام معاملوں کے لئے مفید نہیں ہے اور اس کی بجائے انسانی نظریہ اور طاقت سب سے ضروری ہے۔

فیروز شاہ کے ابتدائی زمانہ میں بہت دشواریاں آئیں۔ سب سے پہلی دشواری سیاسی مخالفت تھی۔ اس نے اس کو حکمت عملی تجربہ کاری

Marfat.com

اور دانشمندی سے دور کیا۔ فیروز شاہ ایک انسان پرور حاکم تھا جس کا
مسلک انسانی اصولوں کو ترقی دے کر راج کی بنیاد تہذیبی اصولوں پر
رکھنا تھا۔ نئے ملکوں کی فتح کی خواہش اور تمنا اس کے دل میں نہ تھی۔
سیاسی راج کی بجائے اخلاقی فتح اس کا منصوبہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے
جہانگیری کی بجائے جہانبانی کے اصولوں کو اپنے سامنے رکھا۔ گو تاریخ
کے لکھنے والے یہ بتاتے ہیں کہ فیروز شاہ کی پالیسی اس کی طبیعت کی
کمزوری کا نتیجہ تھی لیکن اس خیال میں اصلیت نہیں ہے کیونکہ
اس کی راج نیتی کا اصول مذہبی بنیاد پر تھا۔ وہ اپنے زمانے کے ذہنی
اور نفسانی رجحانوں سے مختلف تھا۔ اس کی نظر میں حکومت کرنے کے
معنی یہ نہ تھے کہ لوگوں پر چڑھائی کی جائے اور ان پر قبضہ کیا جائے
حکومت جبر اور زیادتی کا نام نہیں ہے۔ حکومت کو اعلیٰ اصولوں پر
کاربند ہونا چاہیے۔ لڑائی کے بجائے امن حکومت کی بنا ہے۔
اس لحاظ سے فیروز شاہ ایک امن پسند حاکم تھا اور اسی وجہ سے اس نے
اپنے زمانے کے رواجی سیاسی اصولوں اور دستوروں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

فیروز شاہ نے اپنی شاہی کو مذہبیت میں رنگا۔ گو وہ محمد تغلق کے
سیاسی فلسفہ کا ایک زندہ نمونہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کا
مخالف بھی تھا۔ درحقیقت اس نے ان چیزوں کو جڑ سے اکھیڑ دیا۔ فیروز
شاہ نے ایک خاص طرز کی راج نیتی کی داغ بیل ڈالی۔ یہ راج نیتی
مذہبی راج نیتی تھی جس کا اثر شاہی پر، راج پر اور سیاست پر یکساں

Marfat.com

پڑا۔ اس نئے فیروز شاہی اصول کو ہم اسلامی اصول سے تعبیر کر سکتے ہیں جس کی بنیاد اسلامی اور تہذیبی تھی۔ اسلامی قدروں کی ترقی اور تہذیبی اصولوں کا پرچار فیروز شاہ کی شاہی کا سب سے بڑا مقصد تھا۔ اس اعتبار سے راج نیتی اور راج داری اسلامی رنگ میں رنگی تھی اور اس کی بنیاد تہذیبی قدروں پر رکھی گئی۔ دوسرے لفظوں میں فیروز شاہی ایک طرف اپنے کو اسلامی اصولوں کی پابند کئے ہوئے تھی تو دوسری طرف اپنی ترجیحات تہذیبی قدروں سے لئے ہوئی تھی۔

فیروز شاہی میں ایک سلسلہ چلتا ہوا دیکھا۔ اس کا ایک مشن تھا اور وہ مشن دنیادار شاہی سے بالکل مختلف ہے۔ وہ اصل خدا کی حکومت کو زمین پر قائم کرنا اس کا شیوہ تھا اور جس کے تحت اس نے اپنی شاہی کی ترجیحات کی اور اس میں جو نیا پن دکھائی دیا وہ اسلامی اصول کا نمونہ تھا۔ فیروز شاہ نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق حکومت کرے۔ اس وجہ سے فیروز شاہ کے زمانہ میں شاہی کا بنیادی ڈھنگ اور طرز نظر آنے لگا جو پہلے زمانوں کی شاہیوں سے بالکل مختلف تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ چاہتا تھا کہ لوگ اسلامی قانون کی پابندی کریں اور آخرت کا قانون ذہن میں رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا مگر اس قانون سے حکومت کی ترجیحات پر منحصر نہ ہو سکیں۔ فیروز شاہ سے پہلے ہمیں اس بات کا ثبوت تاریخ میں نہیں ملتا ہے کہ تلوار کا قانون اور انسانی اصولوں کے مابین جدوجہد رہی۔ فیروز شاہ نے

Marfat.com

اس بے روک تلوار کے قانون کی چھان بین اسلامی کسوٹی پہ کی اور وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس میں کوئی اصلیت نہیں ہے۔ تلوار کے ذریعہ حکومت کرنا، انسانی ہمدردی اور رواداری کو دور کرنا، وحشی جذبہ کو فروغ دینا۔ ظلم اور تشدد کا بڑھنا ہے، سدھار کی قوت کو گھٹانا ہے اور اپنے مقصد کے حصول میں ناکام ہونا ہے۔ نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسانوں کے زوال کے ساتھ ساتھ اخلاقی بربادی اور بے حرمتی ہوتی ہے۔ یہی سب انصافی کے اصول تھے جن میں فیروز شاہ کو یقین نہ تھا اور اس کے خلاف اس کا ردعمل ایک نئی امن پسند، انصاف پسند شاہی کو قائم کرنے میں رونما ہوا گو وہ شاہی اسلامی نظریوں سے بھرپور تھی۔

ہندوستان میں ایک ایسی ہی نظیر ہمیں پرانے زمانے میں ایک بڑے حاکم کی شخصیت میں ملتی ہے۔ وہ شخصیت اشوک کی تھی جس نے ظلم، تشدد اور قانونِ تلوار کے خلاف یعنی باج نیتی کے اصولوں کے خلاف آواز بلند کی اور جو اپنی حکومت کی بنیاد انسانی اصولوں پہ رکھ کر اپنے کو ام کر گیا جس طرح اشوک نے ایک نئے سماجی اور راج نیتی نظام کی نیو اخلاقی بنیادوں پہ رکھ کر رائج کیا ویسے ہی فیروز شاہ نے حکمرانی کے اصولوں میں بھی تبدیلی پیدا کی تاکہ ملک میں امن بہتر طریقہ سے قائم ہو سکے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ محمد تغلق کے دور کے نراج کا توڑ فیروز شاہی اصول ہی میں کارگر ہو سکتا تھا۔ رعایا کی بے چینی، ملک کی عام فسادی حالت اور بے اعتنائی دراصل نئے جذبات اور نئے نقطۂ نظر سے

یہی حکمت تھی تاکہ انسان کی بھلائی کی حفاظت اور انسان کی پرورش ہو سکے۔ اس لحاظ سے فیروز شاہ کا راج وہ راج تھا جس میں انسانی قوتیں، رحم، نرمی اور مہربانی فروغ پا سکیں۔ حالات کی تبدیلی اس وقت تک ممکن نہ تھی جب تک کہ بے ضابطگی کا دباؤ اور بے قاعدگی کی بندش نہ ٹوٹ سکے۔ اسی وجہ سے فیروز شاہ کی شاہی نے ایک نئی راہ اختیار کی اور اپنے راج میں جبر کے قانون کو انسانی قانون میں بدلا۔ فیروز شاہ کے اس نظریۂ عمل کا یہ نتیجہ نکلا کہ لوگ اس کو اپنا محافظ سمجھنے لگے۔ گو فیروز شاہ کی حکومت اسلامی اصولوں سے بہرہ ور تھی لیکن عوام کی بھلائی اور بہبودی اس کا سب سے بڑا فرض تھا۔ اس اصول کے تحت اس نے تمام بے جا قوانین جن کے تحت رعایا مرعوب تھی ختم کر دیئے۔ تمام وہ چیزیں جو شریعت کے خلاف کسی بھی شعبۂ زندگی میں حکومت کو نظر آئیں ختم کر دیں۔ اس تمام اسلامی تحریک میں جس جذبے نے فیروز شاہ کی شاہی کو زندہ کیا وہ فلاح و بہبود کا اصول تھا۔

نگرانی اور انتظامی نقطۂ نظر سے حکومت کو بہت سے مالی نقصانات اٹھانے پڑے کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے ملک میں بہت سے غیر شرعی ٹیکس لئے جاتے تھے جن کو فیروز شاہ نے یک لخت منسوخ کیا صرف وہی ٹیکس بحال رکھے گئے جو شریعت کے مطابق تھے۔ اس طرح سے فیروز شاہ کی حکومت کی جائز آمدنی کے ذرائع صرف چار تھے

Marfat.com

کئے گئے تھے یعنی خراج، جزیہ، زکوٰۃ اور خمس۔

اس ضمن میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان چار آمدنی کے ذریعوں کی نوعیتوں کی وضاحت کریں کیونکہ ان کے متعلق ہماری تاریخوں میں بہت سی غلط فہمیاں اب تک چلی آرہی ہیں۔ خراج دراصل ایک محصول تھا جو قابل کاشت زمین کے مالک سے خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلمان حکومت لیتی تھی۔ محصول کی شرح ½ حصہ زمین کی پیداوار کا ہوتا تھا۔ زکوٰۃ صرف مسلمان طبقہ سے لی جاتی تھی۔ اس کی آمدنی بیت المال کے لئے وقف ہوتی تھی۔ جزیہ کے متعلق سب سے غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے مفہوم کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم جزیہ کے معنی سمجھیں۔ جزیہ کا لفظ گزیدہ سے نکلا ہے۔ گزیدہ دراصل ایک اعتبار سے ایک پولی ٹیکس (بار برداری) تھا، یہاں تک کہ ایرانیوں نے بھی میسوپوٹیمیا کی فتح کے بعد اس ٹیکس کو اصلی روپ میں رکھا۔ فارسی کی قدیم کتابوں میں بھی لفظ گزیدہ آتا ہے۔ فردوسی شاہنامہ میں بھی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ ابن خلدون نے لکھا ہے کہ ایرانی بادشاہ نوشیروان نے اپنے ملک کی زمینوں کی پیمائش کروائی اور سب پر جزیہ عائد کیا سوائے فوجی ملازموں اور افسران کے۔

اسلام کی تاریخ میں جزیہ نے ایک اہمیت حاصل کی۔ قرآن میں جزیہ سے متعلق صرف ایک ہی آیت ملتی ہے (سورۃ ۹ آیت ۲۹)

اسلامی عمل کے اعتبار سے جزیہ نے دو خصوصی حالتیں اختیار کی ہیں ابتداءً جزیہ کے معنی دراصل مجموعی خراج جو مفتوح علاقوں پر عائد کیا جاتا تھا سمجھا جاتا ہے۔ عربوں نے اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہ رویہ اختیار کیا تھا کہ جب وہ ملک فتح کرتے تو ملک کا انتظام ملک والوں کے ہاتھ رکھتے تھے اور ان سے جو مال گزاری وصول ہوتی تھی وہ جزیہ تصور کیا جاتا تھا یہی ایک مصلحت ہے جس کے ابتدائی اسلامی تاریخ میں جزیہ اور خراج میں کوئی فرق نہیں سمجھا جاتا تھا یہاں تک کہ خراج بحیثیت جزیہ کے اور جزیہ بحیثیت [illegible] کے [illegible] استعمال ہوئے ہیں خصوصاً جو ہم معنی تصور کئے گئے ہیں۔ جرجی زیدان کا [illegible] اسلامی [illegible] کا مورخ یہ لکھتا ہے کہ جزیہ اور خراج ابتداءً مترادف [illegible] سمجھے جاتے تھے [illegible] بلکہ مفتوحہ علاقوں سے جو خراج وصول کیا جاتا تھا وہ [illegible] جزیہ تھا یا اسے [illegible] خراج۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے [illegible] کا تصفیہ کیا گیا کہ خراج اور جزیہ [illegible] الگ [illegible] ہیں اور [illegible] تصفیہ ہوا کہ جزیہ انسانوں پر عائد ہوتا ہے [illegible] بلکہ اس سے خراج زمین [illegible] نہیں ہوتی۔ خراج اس [illegible] زمین پر ہے۔

اس طرح واضح ہوا کہ جزیہ ابتداء سے [illegible]

Marfat.com

اٹلی کا مشہور اورنٹلیسٹ کیٹانی اپنی کتاب "انالی دی اسلام" میں لکھتا ہے کہ جزیہ کی تشریح بحیثیت ایک انسانی ٹیکس کے دراصل ایک جدت ہے جو بعد کے قاضیوں کے ہاتھوں پیدا کی گئی اور جو دراصل اسلام کے ابتدائی زمانہ کے اصلی حالات سے بالکل ناواقف تھے مصری شہادت سنہ ہجری تا سنہ ۹ ہجری کی بنا پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ محض فوج کی تنخواہوں کی ادائی کرنے کے لئے مختص تھا۔ اس لحاظ سے جزیہ دراصل ایک محافظی رقم تھی جو اسلامی مملکت غیر مسلمانوں سے وصول کرتی تھی تاکہ ان کی حفاظت بحیثیت ذمی سماجی، معاشی، مذہبی اور سیاسی حقوق کی پامالی کے بغیر کر سکے۔ دوسرے لفظوں میں ذمیت کا مرتبہ ذمیوں کو حسب ذیل حقوق دیتا ہے۔

(۱) ایذا سے محفوظ رکھنا۔ (۲) حفاظت

پہلے حق سے وہ "امین" تصور کئے جاتے ہیں اور دوسرے سے وہ "محروس" خیال کئے جاتے ہیں۔

ذمیت کی حیثیت میں ذمی کو حق ہے کہ وہ سرکاری ملازمتیں کر سکے اور اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اپنے سماجی اور مذہبی رسم ورواج اور تیوہار منا سکیں۔ ان کے مندروں کی حفاظت اسلام کا قانون کرتا ہے۔ اس طرح اسلامی حکومت ذمیوں کی حفاظت اور ان کے تحفظ کا ذمہ لیتی ہے۔ لشکر اسلام پر یہ مذہبی فرض عائد ہے کہ وہ لڑائی اور مصیبت کے وقت ذمیوں کو بچائے اور ان کی

Marfat.com

حفاظت کرے ۔ دراصل جزیہ زرذمیاں بحیثیت محافظتی رقم کے سمجھا جاتا ہے اور جس سے مراد یہ ہے کہ مسلمانوں کے خون کی قربانی ذمیوں کی راہ میں وقت اور موقع پر لازم ہے ۔ اگر اسلامی حکومت اس ذمہ دارانہ فرض کو ادا نہ کر سکے تو جزیہ لینے کی حقدار نہیں ہے ۔ اسلامی ملکوں کی تاریخی شہادتیں یہ پتہ دیتی ہیں کہ جزیہ اسلامی حکومت نے اس وقت واپس کر دیا جب کہ وہ ذمیوں کی حفاظت کرنے سے قاصر رہی ۔ اسلامی قانون کی رو سے ذمی فوجوں میں شریک ہو سکتے ہیں اگر وہ مجبور نہیں کئے جا سکتے کہ وہ فوج میں شریک ہوں، کیونکہ جس مرتبہ پہ وہ مامور ہیں وہ ذمیت کا مرتبہ ہے ۔ اگر وہ اپنی مرضی اور خوشی سے فوج میں شریک ہوتے ہیں تو ان سے جزیہ نہیں لیا جا سکتا ۔

جزیہ صرف اس نوجوان مرد ذمی پہ عائد ہوتا ہے جس کے جسمانی اور ذہنی قوا شگفتہ ہوں اور جس کے پاس رقم ادا کرنے کا ذریعہ ہے ۔ جزیہ ایک قانون کا پابند تھا یعنی جب ہتیاری قوت کی بنا پر ملک فتح کیا جاتا تھا تو اس وقت یا تو عہد و پیمان ہوتا تھا یا امام وقت کو یقین دلایا جاتا تھا کہ ذمی ہر حالت میں اسلامی حکومت کو سالانہ رقم جزیہ دینے کا وعدہ کرے گا ۔ سالانہ رقم کی شرح حسب ذیل ہے :-

(۱) ۴۸ درم امیر سے وصول کئے جاتے تھے

(۲) ۲۴ درم اوسط جماعت کے لوگوں سے

(۳) ۱۲ درم غریب طبقہ سے

Marfat.com

بچے، عورتیں، معذور، ضعیف، بوڑھے، وہ انسان جس پر کسی قسم کی قانونی ذمہ داری نہ ہو، بھیکاری، اندھے، لولے، برہمن (برہمن سے مراد اس طبقہ سے ہے جس نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہو) جزیہ نہیں دیتے تھے۔ اگر لنگڑے، لولے اور برہمن مالدار ہیں تو ان سے جزیہ لیا جا سکتا تھا۔ غلام مستثنیٰ تھے۔ جزیہ یا تو روپے پیسے میں یا جنس کی شکل میں لیا جاتا تھا۔ اسلامی قانون کی توڑ مروڑ جہاں تک جزیہ کے معنی اور اس کے اطلاق کا تعلق تھا فقہاء نے سیاسی حالات کے تحت کی تاکہ اسلامی حکومت کے سیاسی مفاد کو مضبوط تر کیا جائے اور مفتوح کو جہاں تک ہو سکے بے زبان رکھ کر حکومت کرے۔ محققین کا یہ کہنا ہے کہ ان فقہاء نے لفظ جزیہ سے بے جا فائدہ اٹھایا۔ اسلامی دنیا کے مشہور عالم الغزالی نے قرآن کی آیت (۹۔۲۹) پر جو مختلف مفسرین نے تفسیر لکھی ہیں تبصرہ کیا اور اعتراض کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ وہ جاہلانہ غلط فہمیاں ہیں۔ ابن قاسم کے اعتبار سے قرآن کے الفاظ "وہم صاغرون" کے معنی یہ بھی نہیں لئے جا سکتے کہ ذمیوں کی سیاسی، معاشی، مذہبی اور اخلاقی پستی ہو۔ اس قسم کی توہین کی اجازت اسلام کے قانون میں نہیں ہے۔ عملی اعتبار سے جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ داری فقہاء پر عائد ہوتی ہے۔

ہندوستان کے وسطی عہد میں ہندوؤں کو مسلمانوں کی طرح حکومت کی ملازمتیں ہی نہیں ملیں بلکہ فوجوں میں بھی بھرتی کئے جاتے تھے۔ فیروز شاہ

Marfat.com

سے قبل اس بات کو ثابت کرنا بے حد دشوار ہے کہ ہندو رعایا پر جزیہ
عائد کیا گیا تھا یا نہیں۔ لفظ "جزیہ" کا استعمال اس زمانے کی تاریخی کتابوں
میں بہت کم ملتا ہے۔ اگر جزیہ رائج تھا تو وہ اسلامی قانون کے مطابق نہ
تھا کیونکہ ہمیں کہیں بھی اس قسم کی شہادت نہیں ملتی کہ حکومت کا ڈھانچہ پوری
طور سے اسلامی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ فتوحات فیروز شاہی سے
اس بات کا ثبوت پتہ چلتا ہے کہ پہلے بادشاہوں نے ہندوستان میں
اسلامی اصولوں اور احکام کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہ ان پر چلنے کی کوشش
کی کہ آیا وہ حکومت اسلام کے قانون کے مطابق چل رہی ہے یا نہیں بلکہ اس بات
کا خیال کئے بغیر ملک پر حکومت کی۔ بادشاہ مسلمان ضرور تھے لیکن
ان کی حکومت نظریہ اور عمل کے اعتبار سے اسلامی نہ تھی بلکہ وہ قوانین
کا مجموعہ تھی جن کے ذریعے سیاسی کاروبار چلتا تھا لیکن یہ کہنا کہ وہ
سو فیصدی اسلامی تھی صحیح نہیں ہے۔ چند سلاطین دہلی نے یہ ضرور
کی کہ وہ حکومت کو اسلامی ڈھنگ پر چلائیں لیکن ان کو اس وجہ سے
کامیابی حاصل نہ ہوئی کہ وہ خود اسلامی سیاسی مسائل اور عمل سے بہت
دور ہی نہ تھے بلکہ ناآشنا بھی تھے۔ وہ دراصل سیاسی قوتوں کی پیداوار
تھے ہندوستان کے سیاسی حالات سے ان کو دوچار ہونا پڑا تھا اور ان
ہی سے متاثر ہوئے تھے۔

عہد وسطیٰ میں فیروز شاہ ہی پہلا بادشاہ گزرا ہے جس نے شاہی
حکومت کو اسلامی حکومت میں بدلنے کی کوشش کی کیونکہ اس کا مسلک

Marfat.com

اسلامی تھا۔ اس کے زمانہ میں جزیہ بحیثیت ایک اسلامی قانون کے رائج تھا۔ تاریخ فیروز شاہی یہ بتاتی ہے کہ ہندوؤں اور وحدت پرستوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وہ ذمیت کے مرتبے قبول کریں اور نذرانہ دیں اور حکومت اپنے ذمہ تمام ذمہ داریاں لے اور حکومت اپنے ذمیوں کی حفاظت لے تاکہ وہ بلا روک ٹوک کے اپنے مذہبی عقائد اور اپنے رسم و رواج کے پابند رہ سکیں۔ شمس سراج عفیف اپنی کتاب تاریخ فیروز شاہی میں جزیہ کی شرح جو فیروز شاہ کے زمانہ میں رائج تھی یوں لکھتا ہے۔

(۱) ۴۰ تنکہ ، (۲) ۲۰ تنکہ ، (۳) ۱۰ تنکہ

آخر میں چل کر یہ شرح (۱۰) تنکہ اور (۵۰) جدل ہو گئی۔

خمس کے متعلق اسلامی قانون یہ ہے کہ جو مال غنیمت لڑائی کے زمانہ میں مفتوح علاقوں سے "لشکر اسلام" حاصل کرتا ہے اس کا ۱/۵ واں حصہ حکومت کو لینا چاہیئے اور بقیہ واں حصہ فوج میں تقسیم ہونا چاہیئے۔ ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں نے اس اسلامی حکم کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا اور شاید ایسا عمل مسلمان بادشاہوں نے بھی اپنے دورِ حکومت میں بھی اختیار نہ کیا ہو۔ فیروز شاہ تغلق نے اس اصول کو رائج دیتے ہوئے اپنی کتاب "فتوحاتِ فیروز شاہی" میں یہ لکھا ہے کہ اس قانون پر عمل نہیں کیا گیا اور اس کو بالکل نظر انداز کیا گیا اور آئندہ سے مالِ غنیمت کا ۱/۵ حصہ صرف حکومت لے گی۔

Marfat.com

جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ فیروز شاہ کی شاہی محافظتی تھی۔ اس کو رعایا کی بھلائی کا بے حد خیال تھا۔ رعایا کی دلجوئی اور بہبودی اور خیال کا اظہار کہیں بھی اس سے نمایاں طور سے نہیں ہو سکا جیسا کہ اس نے ایک فرمان کے ذریعہ دو کروڑ تنکوں کا بقایا جو رعایا کی جانب سے وصول طلب تھا منسوخ کر دیا۔ یہ وہ رقم تھی جو محمد تغلق کے زمانہ میں حکومت کی جانب سے رعایا کو دی گئی تھی تاکہ وہ اپنی زمینیں، مکانات اور دیہات جو قحط کے زمانہ میں خراب اور تباہ ہو گئے تھے درست کر لیں۔ فیروز شاہ نے اپنے وزیروں سے اس مسئلہ پر بحث کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اگر یہ قرضہ رعایا سے وصول کیا جائے تو اس سے ان کی حالت اور زیادہ بد سے بدتر ہو جائے گی کیونکہ ان میں اتنی سکت باقی نہیں کہ وہ اس قرضہ کو ادا کر سکیں۔ خدشہ اس بات کا تھا کہ کہیں بیزاری اور زیادہ نہ بڑھ جائے اور لوگوں میں بغاوت کے عناصر پھوٹ پڑیں اس خیال کے تحت فیروز شاہ نے اعلان کیا کہ تمام وہ سرکاری دستاویزیں جن میں رعایا کے قرض درج ہیں پبلک کے سامنے منسوخ کر دی جائیں عوام کے معاملات میں کسی بادشاہ کا یہ ایک نرالا مگر انسانی طرز عمل تھا جو فیروز شاہ کی شاہی کی جدت پسندی کو واضح طور سے دکھاتا ہے تاکہ رعایا خوش و خرم رہے اور اطمینان کی نیند سو سکے۔ اس شاہی عمل سے رعایا کو سکون ہو گیا اور وہ احسان اور ممنونیت میں ڈوب گئی۔

Marfat.com

اس طرح فیروز شاہ کی سخاوت اور اس کے انسانی پن کا اظہار زمین اور اس کے لگان کے مسئلہ سے ہوتا ہے۔ لگان کا مسئلہ ہمیشہ سے ایک الجھن اور گتھی بنا رہا ہے کیونکہ ہندوستان کا اصل مسئلہ زمین اور اس کا لگان ہے جو اس مسئلہ کو حل کرے گا وہی ہندوستان کی بھلائی کرے گا۔ فیروز شاہ نے اس مسئلہ کو ایک گہری ہمدردانہ اور راج نیتک نظرسے دیکھا کیونکہ رعیت حکومت کی ریڑھ کی ہڈی تصور کی جاتی ہے اس غور و فکر کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیروز شاہ نے وہ غیر دانشمندانہ ضابطے اور اصول جو پچھلے زمانے سے چلے آ رہے تھے اور جن کی وجہ سے رعیت کو مصیبت اور دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا یک لخت ختم کر کے شرح جو معین کی گئی وہ زمین کی پیداوار کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے اور رعیت کی ادا کرنے کی صلاحیت کا خیال رکھتے ہوئے کی گئی کیونکہ جو اصول پیش نظر تھا وہ یہ کہ ایسا محصول حکومت نہ لے جس کی ادائی رعایا کی قوت سے باہر ہو۔ اس طرح فیروز شاہی عہد میں ہر بے جا اور نا واجب محصول اور ٹیکس بند یا ختم کئے گئے۔ وہ عمل کہ "ایک کا دے چھوڑ دو باقی سب لے لو" فیروز شاہ نے ناجائز قرار دیا۔ اسی سلسلہ میں نئے قانون عمل میں لائے گئے تاکہ پیداوار و سیع تر ہو سکے اور رعایا کی خوشحالی بڑھ سکے۔ رعایا کے مفاد کے تحت یہ لازم گردانا گیا کہ مقررہ سرکاری محصول سے زائد لینا قاعدہ کے خلاف تھا۔ فیروز شاہ کی شاہی اس طرح انصاف اور برابریت کے اصول کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہوئی کسی شخص کو یہ اختیار حاصل

Marfat.com

نہیں تھا کہ وہ ظلم اور تشدد کر سکے اور نہ دقت اور دشواری دوسروں کی راہ میں پیدا کر سکے۔ تمام ملک میں امن اور حفاظت کے ساتھ انسان زندگی بسر کرنے لگے۔

گو فیروز شاہ ایک پُرامن بادشاہ تھا جس کو رعایا کے دکھ درد کا خیال رہتا تھا۔ لیکن مذہبی دُنیا میں اس کے خیالات اور جذبات قدامت پسند تھے۔ وہ محمد تغلق جیسا وسیع النظر نہ تھا اور نہ رواداری کی اسپرٹ اس میں تھی۔ وہ ایک مذہبی انسان تھا جو اسلام کے قدامت پسند اسکول کا حامل تھا۔ اسلام میں "آزاد خیالی" اور "آزادی کا تصور" اس کے پاس نہ تھا۔ غالباً فیروز شاہ کے مذہبی ایمان کی تشکیل میں علماء کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہو، کیونکہ اس کے دورِ حکومت میں علماء کو نہ صرف عزت اور مرتبہ حاصل ہوا بلکہ تمام امورِ حکمرانی میں دخل کافی سے زیادہ تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ علماء کا طبقہ فیروز شاہی حکومت پر غالب تھا تو مبالغہ نہ ہوگا۔ محمد تغلق نے علماء کو ان کے درجہ سے گرایا ہی نہ تھا بلکہ ان پر کڑی نگرانی رکھ کر ان کی بندش کی تھی۔ ان کی سیاسی قوت کو توڑا اور ان کے مذہبی اثر کی روک تھام کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء ایک سماجی اور مذہبی جماعت کی حیثیت سے بے لگام نہ ہو سکے۔ محمد تغلق کے زمانہ میں ہمیں اس بات کی بھی شہادت ملتی ہے کہ اس زمانہ کی مذہبی دنیا میں مختلف قسموں کی آزاد پسند تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں اور جن کا اثر عام لوگوں پر نمایاں ہو رہا تھا لیکن بادشاہ کی جانب سے

Marfat.com

کسی بھی فرقہ کی مخالفت یا جبر و تشدد سے ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اور نہ ایک ہی مذہب پہ چلنے کی تاکید کی گئی۔ مختلف خیال کے مذہبی علمبرداروں نے وجودیت سے دہریت کے نعرے لگائے یہاں تک کہ "انا الحق" کے فلسفہ کا بھی پرچار کھلم کھلا کیا گیا۔ اس کے ساتھ امام مہدی کی آمد کا بھی اعلان کیا گیا۔ ایسے بدعتی رجحانات اور ایسی تحریکیں محمد تغلق کے زمانہ میں عام ہوگئی تھیں۔

فیروز شاہ کے دور میں ایک زبردست ردِ عمل ان تمام "لامذہبیت" اور "لادینیت" کے خلاف پیدا ہوا۔ فیروز شاہ جو ملک میں اسلامی طرز حکومت قائم کرنا چاہتا تھا اس کو ان تمام غیر مذہبی اور لامذہبی قوتوں کے خلاف لڑنے کے لئے دراصل علماء کی جماعت کی رضامندی، تعاونِ عمل اور رہنمائی کی ضرورت تھی کیونکہ علماء اسلامی علوم، اسلامی قانون اور دستور کے مفسر اور محافظ تھے لہذا فیروز شاہ نے جو قدم ان تحریکوں کی روک میں اٹھایا وہ علماء کی امداد کے بغیر ممکن نہ تھا۔ نتیجہ کے طور پر علماء کی جماعت طاقتور بن گئی اور ان کی نظر میں جو اسلام اور اسلامیت کا تصور تھا اس کو فیروز شاہ کی تائید اور عمل حاصل ہوا اور اس طرح ایک دور خلاف اسلامی تحریکوں کی رد میں شروع ہوا اور ملک کو ان تمام بدعقیدتی رجحانات سے پاک صاف کیا جانے لگا جس طرح کہ فیروز شاہ کی مذہبی پالیسی سے مسلمانوں کے طبقے متاثر ہوئے، اسی طرح ہندو بھی زد میں آئے۔ گو وہ ذمی کی حیثیت

Marfat.com

سے زندگی بسر کر رہے تھے اور ذمی ہونے کی حیثیت سے ان کی مذہبی زندگی میں حکومت مخل نہیں ہو سکتی تھی۔ ان حقوق کی حفاظت کی گئی تھی لیکن اسلامی اصول کے نقطۂ نظر سے غیر مسلم ذمی کو یہ اختیار حاصل نہ تھا کہ وہ نئے مندر نو آباد مسلمانی علاقوں میں تعمیر کرے۔ فیروز شاہ نے تغلق پور، صالح پور اور کوہانہ نئے شہر آباد کئے تھے۔ یہاں ہندوؤں نے مندر بنالئے۔ یہ مندر فیروز شاہ کے حکم سے توڑ دیئے گئے۔ ان مندروں کے متعلق "فتوحات فیروز شاہی" میں تفصیلی حالات ملتے ہیں۔ اس میں لکھا ہے کہ ہندو اور مسلمان تیوہاروں کے موقعوں پر جو ان مندروں کے سلسلہ میں ہوا کرتے تھے جاتے تھے اور عورتوں کا بھی کثرت ان جگہوں میں آنا جانا ہوتا تھا مرد اور عورتوں کے ملنے جلنے کی وجہ سے پبلک میں عام رسوائی کے چرچے ہوا کرتے تھے اور بد اخلاقی پھیلتی جاتی تھی۔ یہ مندر اصل عقیدت اور بندگی کے گھر نہ بن سکے بلکہ شیطانوں کا اڈہ بن گئے تھے۔ فیروز شاہ نے ایک طرف اسلامی قانون کے تحت اور دوسری طرف پبلک کی بھلائی کے پیش نظر ان مندروں کو توڑا۔ فیروز شاہ نے عام طور سے بحیثیت سرکاری پالیسی کے مندر نہیں توڑے۔

دسواں باب

ہندوستانی مسلمانی راج کا سرسری جائزہ

اس ضمن میں یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک سرسری نظر ہندوستانی مسلمانی راج کے دور پر ڈالیں تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ آیا مندروں کے بحال رکھنے یا مسمار کرنے میں مسلمانی راجوں بادشاہوں کی عام پالیسی کیا رہی ہے۔ یہ خیال عام طور سے پھیلا ہوا ہے کہ اسلام "تلوار یا موت" کا نام اُن لوگوں کے لئے ہے جو مسلمان نہیں ہیں یعنی اسلام کا قبول کرنا جان کو بچاتا ہے ورنہ اسلام کی تلوار موت کے گھاٹ اتارتی ہے ہندوستان کی بیشتر تاریخی کتابوں میں یہ بیان ملتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں نے ہندوستان میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ جبر کیا وہ یا تو "اسلام قبول کرو یا اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھو" کا تھا یہ خیال دراصل ایک تعصب، جہالت، کوتاہ نظری اور لاعلمی کا نتیجہ ہے جیسا کہ ہم پچھلے باب میں ایک جگہ کہہ آئے ہیں کہ اسلام نے اپنی تاریخی

Marfat.com

حیثیت میں دو پہلو اختیار کیے پہلا پہلو اس کا وہ ہے جب کہ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے تھا۔ دوسرا بحیثیت ایک سیاسی طاقت کے تھا۔ اسلام بحیثیت ایک مذہبی طاقت کے بالکل مختلف ہے اس طاقت سے جس کا نام تلوار ہے۔ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے اپنے رویہ کو بالکل جداگانہ طور پر بزرگوں اور صوفیوں کے ذریعہ سے ظاہر کرتا ہے جو دنیا کے مختلف حصوں میں جاکر امن وسلامتی کا پیام دیتے رہے اور جنھوں نے زندگی کی عام تہذیب میں ایک بہت ہی بڑا حصہ لیا۔ اس اسلام کا تعلق اُس اسلام سے مطلق نہیں جو تلوار کی قوت کی بنا پر ملکوں کو فتح کرتا رہا یہ اصل میں اسلام نہ تھا بلکہ بادشاہوں کا "اسلام" تھا جو اپنے کو مسلمان کہتے تھے لیکن وہ مسلمان اصلی اعتبار سے نہ تھے۔ نہ ان کو اسلام معلوم تھا اور نہ اسلام کے قوانین سے واقفیت تھی اور نہ انھوں نے اس بات کی کوشش کی کہ اسلام کے سچے اصولوں پر چل کر لوگوں کی بھلائی کرکے ثواب کمائیں ایسے اسلام کے بادشاہ ہندوستان ہی میں نہیں ہوئے تھے بلکہ وہاں بھی تھے جہاں مسلمان ہی مسلمان آباد تھے۔ خود مسلمانوں کی عام تاریخ میں جو شہادتیں ملتی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومتیں جو اسلام کا نام لے کر چلیں وہ اصلی اسلام سے بہت دور تھیں، گو وہ سب کے سب مسلمان تھے، یہاں تک کہ چند خلیفوں کو چھوڑ کر باقی جتنے بھی خلیفہ تھے وہ مسلمانوں کے رسول اور قرآن کے احکام کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ہوس، اولوالعزمی اور خودداری کے تحت مسلمانی زندگی پر آمر کی حیثیت میں حکومت کرتے گئے

Marfat.com

اس کے علاوہ مسلمانوں کی آپس کی جنگیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ ایک ہی برادری کے لوگ، ایک ہی مذہب کے لوگ، اور ایک ہی خدا کے ماننے والے لوگ اسلامی حکومت قائم نہ کر سکے اور نہ اسلامی اتحاد اور نہ اسلامی بھائی چارہ، گو دعوے سب کے یہ تھے کہ وہ ایک ہیں اور ایک مذہب کے اور ایک کتاب کے ماننے والے۔ اسلامی دنیا کی یکجہتی کا فقدان اسلام کی سیاسی قوت کو کمزور کر گیا ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت محمد کے انتقال کے ۲۱ سال بعد اصلی اسلام دنیا سے غائب ہو گیا اور سیاسی اسلام مختلف روپ اور شکل میں دنیا کے مختلف علاقوں میں ابھرتا رہا۔ ہر جگہ اسلام نے ایک مقامی قومی رنگ اختیار کیا۔ ایک عالمی اسلامی دنیا کا فقدان در اصل مقامی قومی رنگ اور اسلام کی مختلف طرز کی دنیاؤں کا نتیجہ ہے جتنی بھی مسلمانی حکومتیں وجود میں آئیں وہ اس جذبہ کے تحت کہ ہر علاقہ کے مسلمانوں نے دوسرے علاقہ کے مسلمانوں سے اپنی مخصوص وحدت کو الگ سمجھا گو اسلام کے اعتبار سے ایسا نہ ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح اسلام کی دنیاؤں میں سیاسی یکجائیاں اپنے اپنے مقصد اور مسلک کو لے کر چلیں، اس بات کا خیال کیئے بغیر کہ ان کی سیاست کاری اور سیاسی حکمت عملی کے نتائج اسلام کی یکجہتی کے لیئے کیا نکلیں گے۔ یہ وہ اسلام کے روپ ہیں جو سیاسی اصولوں کے تحت پھلے پھولے۔ ان کی نشو و نما مذہب اسلام نے نہ کی بلکہ اسلام کی تلوار نے کی جو ایک دوسرے کو ایک دوسرے سے الگ

Marfat.com

کرتی گئی اور دشمنائی، غیرت مندی اور بے اعتنائی کے بیچ آپس میں ہوتی رہی۔ لہٰذا اسلام بحیثیت ایک سیاسی قوت کے مسلمانوں میں نفاق، فرق اور علیحدگی پیدا کر گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کی تاریخ کے ورق خون سے لکھے گئے اور خون کی بو ان میں سے آتی ہے، گو اسلام بحیثیت ایک مذہب پُرامن زندگی کا پیام انسانوں کو دینے آیا تھا۔ ایسا ہی ہندوستان کے مسلمانی شاہوں نے بھی کیا۔ انھوں نے اسلام کی خدمت اور سیوا نہیں کی۔ وہ اسلام کے قانون کے پابند نہ رہے۔ وہ وقت اور زمانہ کے تابع تھے اور ان کو معلوم تھا کہ وقت اور زمانہ ان کی حکومت کی پائداری کے لئے کتنے اہم ہیں۔ حکمت عملی ان کی شاہی کے روپ میں کام کرتی رہی۔ ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ انھوں نے اسلام کو زندہ کرنے کی کوشش کی گو وہ اس جستجو اور کاوش میں ناکام رہے۔ کیونکہ اسلام کے پرچار کی صلاحیت ان میں نہ تھی اور نہ ان کی تربیت بحیثیت ایک خادم اسلام کے ہوئی تھی۔ وہ بادشاہ تھے۔ ان کی زبان پہ اسلام کا نام الٹ پھیر کرتا تھا لیکن وہ اسلام کے سیوک نہیں تھے اور نہ وہ بن سکے وہ اسلامی جذبہ سے بیٹے ہوئے تھے۔ ان کے مفہوم کو نہ پہچانا تھا اور نہ سمجھا تھا اور نہ یہ معلوم کیا تھا کہ اسلام ایک مذہب ہے جہاں جہاں اسلام گیا اس کی ترقی کن محرکوں کا نتیجہ تھی وہ اس سے بے بہرہ تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیل سکتا ہے اور پنپ سکتا بھی ہے۔ یہ ان کی غلط فہمی اور کوتاہ نظری تھی، گو انھوں نے اس بات

کی کوشش بھی کی کہ اسلام کو علماء کی مدد سے زندہ کیا جائے۔ علماء کا طبقہ ہمیشہ سے عالموں کا طبقہ رہا اور جن کو درباروں میں عزت حاصل رہی تھی، وہ درباری فضا میں پڑھے، پلے اور سیانے ہوئے تھے لیکن اسلام کے پُرامن اصول زندگی کو پھیلانا نہ جانتے تھے اور نہ اس کے مفہوم کو سمجھتے تھے اور نہ جتانے کی کوشش کرتے تھے کیونکہ وہ کتابی منش تھے۔ دل میں ان کے میل، تعصب اور کدورت بھری ہوئی تھی۔ ان کا مفہوم اس اسلام سے متعلق جو تھا قدامت پسند تھا انھوں نے اسلام میں ترقی پسند اصولوں کو نہ دیکھا تھا اور نہ محسوس کیا تھا۔ ان کے سامنے اسلام ایک جکڑا ہوا زبردست کڑا قانون تھا جس میں لوچ کی بجائے سختی، وسعت کی بجائے بندش، آزادی کی بجائے پابندی تھی۔ انھوں نے کبھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اسلام کو اس ماحول اور روپ میں دیکھیں جب کہ وہ دنیا کے مختلف انسانوں کو اپنے اثر میں لا چکا تھا اور نہ اس بات کو محسوس کیا کہ اسلامی قانون کس طرح اپنے آزاد دین میں انسانیت کے جذبہ کو فروغ دیتا ہے۔ وہ محض اسلام کے عالم تھے اور ان کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ اسلام کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں لیکن وہ اس قوت کو نہیں جانتے جو بغیر جبر و تشدد کے انسانوں کے دلوں میں انقلاب پیدا کرتی ہے کیونکہ اسلام کی روح سے وہ متاثر نہ ہوئے تھے۔ ان کے ہاں اسلام کا ظاہری روپ "اسلام" تھا۔ شاہی قوت کے تحت اسلام کے احکام

Marfat.com

کا منوانا اور اس پر عمل کرانا ان کا شیوہ تھا جو انھوں نے اپنے سامنے رکھا۔ یعنی وہ اس اسلام کے علمبردار تھے جس کو تلوار کا اسلام کہتے ہیں یہی وجہ تھی کہ انسانی اور غیر انسانی زندگیوں پر جو بپتا پڑا اور ظلم ڈھایا گیا اس کی ذمہ داری ان ہی علماء پر عائد ہوتی ہے جو انسانوں کے ہمدرد نہ تھے بلکہ وہ ایک پژمردہ، جامد اور ڈھونگ رچے ہوئے اسلام کے نمائندے تھے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ علماء نے جو کھیل شاہی کی پشت پناہ میں کھیلے وہ واقعات مسلمانوں کے ملکوں میں ویسے ہی نمایاں طور سے ظاہر ہوئے جیسے کہ ہندوستان میں یعنی سیاسی قوت یا حکومت کو اکثر وبیشتر اس علماء طبقے نے گمراہی کے راستہ پر چلا کر بادشاہوں کو بدنام کیا۔

جس طرح مسلمان ان علماء کے ہاتھوں گمراہ ہوئے اور اپنی آزاد زندگی کے میدان کو ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھے اسی طرح غیر مسلموں کو بھی ان سے نقصان اور ضرر پہنچا گو دعوے ان کے یہ تھے کہ وہ اسلام کے قانون کی بھی ترجمانی شاہی احکام کے ذریعہ سے کر رہے ہیں اور کروا رہے ہیں۔

ہندوستان میں قدیم ترین زمانہ سے مورت پرستی کے خلاف مختلف زمانوں میں قوی ردعمل پیدا ہوتا رہا اور انسانوں کے سامنے اس نظریہ کو بھی پیش کیا گیا کہ وحدت کا اصول اعلیٰ زندگی کی پرداخت اور تہذیب کے لئے بہت ہی مقدم اور ضروری ہے۔ انسان مورت پرستی کے ذریعہ سے اپنے میں دنیاوی، مادی جذبات اور خواہشات کو پیدا کرسکتا ہے اور وحدت کا اصول انسانی تہذیب اور روحانیت سے [illegible]

Marfat.com

مسلمانوں کے آنے سے بہت قبل ہندوستان کی دنیا میں پھیل چکی تھیں اور ان کے اثرات بھی رونما ہو چکے تھے ۔ برہمنیت اور خلاف برہمنی تحریکیں جو ہندوستان میں چلی تھیں ان کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مذہب کی روح اور مذہب کے روپ میں فرق ہے ۔ اس فرق کی وضاحت صدیوں تک ہمارے ملک کے پہنچے ہوئے ذی فہم اور سلجھے ہوئے لوگوں نے کی اور ایک ایسی فضا ملک میں پیدا کی جس کا نتیجہ آزاد پسند خیال اور امن پسند زندگی تھا۔ ہمارے پروہت بھی دراصل اسلام کے علماء کے ہم رتبہ تھے ۔ ان کی ذہنیت بھی وہی تھی جو اسلام کے "پنڈتوں" کی رہی تھی ۔ انھوں نے بھی مذہب کے روپ کو ہمیشہ اصلی مذہب سمجھا اور لوگوں کو روح کے راستہ پہ چلنے سے گمراہ کیا۔ لہذا یہ پنڈت مختلف حیثیتوں میں ہندوستان کی صدہا سال تاریخ میں اہم ترین کھیل کھیلتے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں اس بات کی وضاحت بہت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے اس ملک میں مختلف دوروں میں مذہبی رواداری کے متعلق حکومت نے کیا رویّہ اختیار کیا تھا۔ ہندوستان کی ابتدائی تاریخ میں مذہبی دنیاؤں کا تصادم ہوا ، لیکن تلوار کا استعمال مذہب کے پرچار میں نہیں کیا گیا۔ مذہبی علمبرداروں نے جو تحریکیں ملک میں چلائی تھیں ان سے خیالوں کا تضاد تو ضرور ظاہر ہوا لیکن جبر و تشدد کا استعمال اس اعتبار سے کہ لوگ قوت کے دباؤ کی وجہ سے مذہب بدلیں بہت کم دکھائی دیا ، گو ایسے واقعات حکومت

سکے۔ باؤ سے کہیں کہیں نظر آنے لگے۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں ایسی
مثالیں ملتی ہیں۔ عام طور سے ساتویں صدی تک ہندوستان میں رواداری
کا اصول کام کرتا ہوا دکھائی دیتا لیکن ساتویں صدی سے لے کر دسویں
صدی تک جب کہ ہندوستان میں برہمنیت کا ایک نیا دور جو سیاسی
قوتوں سے مل کر کھلا کہ ہندوستانی زندگی کی شدت [illegible]
ملک پر چھا گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ برہمنی فرقہ [illegible]
تھی اس کو دوسرا جنم سیاسی قوتوں کی مدد سے [illegible]
پرانے اصولوں پر چلتی ہوئی نظر آتی تھیں [illegible]
میں اس نے حکومتوں پر دباؤ ڈال کر [illegible]
ہو یعنی دھرم شاستر کے مذہب برہمن فرقہ [illegible]
خلاف تھی اور جہاں جہاں اس کا اثر [illegible]
دوسرے مذہبوں کی نشانیاں مٹا دیں۔ [illegible]
برہمن نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے کر [illegible]
یہی وجہ تھی کہ برہمنیت کے زور پکڑنے کے بعد ہندوستان میں غیر برہمنی
مذہب مثلاً بدھ مت اور جین مت جن کا دائرہ اثر کافی وسیع تھا سمٹنے اور
محدود ہونے لگا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب ہندوستان کے گوشے گوشے
میں بدھمتی اصولوں کی گونج سنائی دیتی تھی اور اب وہ زمانہ آ گیا
جب کہ ان کے بڑے اور چھوٹے تہذیبی مرکز بھی اپنی حیثیت سے نابود
ہو گئے یا یوں کہئے کہ ان مرکزوں پر برہمنی تسلط قائم ہوا۔ یہ طریقہ برہمنی

تبلیغ کے ان اثرات کو عیاں کرتا ہے جس سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بدھوں اور جینیوں کے مقدس مقامات کی توہین اور بربادی برہمنیت کے ہاتھوں بڑی بے دردی کے ساتھ ہوئی کہ تاریخ بھی اپنے ورقوں میں ان کا ذکر کرتے ہوئے شرماتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ایسی مثالیں بھی ہماری تاریخ میں ملتی ہیں کہ بعض راجاؤں نے مختلف جذبے کے تحت مندر توڑے اور لوٹے، مورتیاں توڑیں۔ یہ زمانہ وہ تھا جب کہ مسلمانوں کا وجود ہندوستان میں نہ تھا۔

مسلمانوں کی ایسی یا سیاسی حکمت عملی مندروں سے متعلق جو رہی اس کا کیا انداز تھا یہی نہیں بلکہ تاریخ کی لکھی ہوئی کتابیں کو بڑی ... مندروں کی مسماری جو مسلمان حکمرانوں سے ... متعلق بہت سے من گھڑت غیر تاریخی قصے بھی گھڑے گئے ... کیا جائے کہ مسلمان بادشاہوں کا سب سے اولین فرض یہ تھا کہ وہ مندروں کو مسمار کریں تاکہ کفر کا خاتمہ ہو اور اسلام کو ترقی حاصل ہو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا ایک شرعی حکومت جس کا حاکم مسلمان ہو کیا اس پر یہ فرض قانون اسلام کے مطابق عائد ہوتا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے مذہبی عقائد کو ٹھیس پہنچائے اور ان کی عبادت گاہوں کو برباد کرے۔ شرع کے بموجب اسلامی حکومت اس اصول کی پابند ہے کہ وہ ان ذمیوں کے جو اس کے امان میں ہوں اور جنہوں نے اپنی حیثیت ذمی کے تسلیم کر لیے ہوں، جان و مال، ان کے عقائد

[illegible]

Marfat.com

کریں کہ ان حکمرانوں نے کس جذبہ کے تحت مندر ڈھائے۔ ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ آیا یہ مسلمان حکمران شرع کے پابند تھے یا انھوں نے اپنی حکومت کو شرعی بنانے کی کوشش کی تھی۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے بیشتر حکمرانوں نے اس بات کی کبھی پروا نہیں کی کہ آیا ان کی حکومت قانون اسلام پر کاربند ہے یا نہیں گو حکومت کے نظام میں جو اسلامی اصطلاحیں استعمال کی گئی تھیں ان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان میں اسلامی اصول کار فرما نہ تھے مثلاً "بیت المال" جس کے معنی اسلامی نقطۂ نظر سے دوسرے ہیں لیکن ہندوستان میں یہ لفظ بحیثیت "سرکاری خزانہ" کے استعمال کیا گیا۔ اسی طرح "لشکر اسلام" کا لفظ ایسی فوج میں استعمال کیا گیا گو لشکر اسلام درحقیقت اس لشکر کو کہتے ہیں جو اسلام کی راہ میں لڑے نہ کہ فوجی سپاہی جنگیں لڑے جیسا کہ ہمارے ملک میں ہوا ہے۔

قانون اسلام کے بموجب مسلمان حکمراں کا یہ سب سے بڑا فرض تھا کہ وہ جب کسی ملک کو فتح کرے تو اس بات کا اعلان کرے کہ وہ ملک پر جس حکومت کو قائم کرنا چاہتا ہے وہ اسلامی ہوگی اور غیر مسلم لوگ اگر اس اسلامی حکومت میں رہنا چاہتے ہیں تو انکو امان مل سکتا ہے اور ان کی جان و مال کی حفاظت، ان کے عقیدے کی آزادی اور ان کے مقدس مقامات کی نگرانی اور حفاظت ہوگی جب کہ وہ ذمی کی حیثیت میں رہنا چاہیں۔ ایسا اعلان عربوں نے صرف سندھ کی فتح کے سلسلہ میں کیا تھا۔

لیکن دوسرے مخلص مسلمان [illegible] ہندوستان کی تاریخ میں گزرے
انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ کم از کم دو مثالیں [illegible] حکمرانوں
مثلاً فیروز شاہ تغلق اور [illegible] جن کی [illegible] انھوں نے اس بات
کا اعلان کیا کہ ان کی حکومت [illegible] کے اصولوں کی پابند رہے گی لیکن
جو اطلاعات [illegible] تحقیقات [illegible] ان سے ایسا معلوم [illegible]
[illegible] [illegible] بنانے [illegible] کی کوشش
نہیں کی گئی [illegible] سوال [illegible] اور [illegible] اعلان سے
ذریعہ دریافت کیا گیا کہ کون سی حیثیت میں رونما ہوا کرتا ہے
اور کون نہیں ہونا چاہیے [illegible] حکمرانوں نے [illegible] حکومت
کو شرعی بنانے کی کوشش [illegible] کی جب [illegible] اسلام کے قانون
پر حقیقی معنی میں پوری [illegible] نہیں ہوتا ہے۔

ہندوؤں کی [illegible] اور زیادہ پیچیدگی اور [illegible]
پیدا ہو جاتی ہے جب [illegible] ادا [illegible] مسلمان
حکمرانوں نے جزیہ لیا [illegible] تو اسے کو شرع کے مطابق [illegible]
ذمی لینے کے بعد ایک اسلامی حکومت پر فرض ہوتا ہے کہ وہ غیر
مسلموں کے [illegible] لگائے۔ اگر ہندوستان کے مسلمان
حکمرانوں نے قانون اسلامی [illegible] ہندوؤں سے [illegible]
اختیار کی تو وہ واجب [illegible] کہا جائے گا کہ انھوں نے اسلام پر
عمل نہیں کیا اور [illegible] کی طرح حکومت کرنے کی کوشش کی۔ یا تو وہ

مسلمان نہ تھے اور انھوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اپنی ہوس اور دل کی تعصبانہ خواہش کو پورا کرنے کے لئے کیا اور اگر وہ مسلمان تھے اور اسلام کا قانون ان کا اپنا عقیدہ تھا تو ان کو [illegible] اسماری اصولاً نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں نے جہاں مندر توڑے وہاں اس [illegible] بھی چھوڑی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ مندروں کی [illegible] اوقاف دیئے گئے جو نسلاً بعد نسلاً آج تک ہندوستان [illegible] علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر اورنگ زیب [illegible] کی تاریخیں اس بات سے بیان کرتے ہیں کہ [illegible] زیب نے تمام شمالی ہندوستان کے [illegible] توڑے تھے لیکن [illegible] کے ساتھ ساتھ اورنگ زیب [illegible] شاہی فرمان ایسے بھی [illegible] ملتے ہیں ان کے پڑھنے سے [illegible] بات کا پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے مندروں کی بحالی کے سلسلے [illegible] شاہی وظیفے دیئے تھے۔

یہ سوال کہ حکمرانوں نے مندر توڑے اور ان کی مرمت بھی کی ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اسلامی نقطۂ نظر سے نہیں دیا جا سکتا اور اگر دیا بھی جا سکتا ہے تو اس طرح سے کہ یہ وہ نئے مندروں کے جن کی تعمیر کی اجازت اسلامی ریاست میں نہیں ہو سکتی کیونکہ اسلام کے قانون کی رو سے جب مسلمان نئے ملک فتح کرتے ہیں اور ذمی ان کے امان میں آتے ہیں اور زر ذمیان دینا تسلیم کرتے ہیں تو انکی

Marfat.com

پرانی عبادت گاہ پر گورنمنٹ نے قبضہ کر لیا تھا لیکن جیسا [illegible] بات کی
اجازت قانون اسلام کی رو سے نہیں [illegible]
ہماری تاریخ اس قسم کی مثالوں [illegible]
سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اسلام کی اشاعت [illegible] نہیں
کیا اور غیر مسلموں کے ساتھ [illegible] دل
کا نتیجہ تھی [illegible] حکمرانوں
کو [illegible] استعمال [illegible] نہیں کی بلکہ ان کو حق انتخاب
سے نامزد کیا ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے نافذ سمجھے جاتے

Marfat.com

تھے۔ لیکن وہ اس اصلیت سے بہت دُور تھے۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ ہندوستان پر کس طرح حکومت ہو سکتی اور کی جا سکتی ہے۔ اسلام کو ان کی خدمات کا صحیح اندازہ کرتے ہوئے تاریخی اصلیت سے گریز کرنا ہوگا۔

ہندوستان کی تاریخ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مندروں کی مسماری دراصل اشانتی کے زمانہ میں زیادہ نمایاں طور سے نظر آتی اور امن کے زمانہ میں اس میں بے حد ترقی واقع ہوئی۔ ہم دیکھ آئے ہیں کہ ہندوستان میں ایسی مقدس عبادت گاہیں بھی تعمیر کی گئی تھیں جو ایک بد اخلاق زندگی کا گہوارہ بنی ہوئی تھیں جہاں عقائد کی درستی کے بجائے زندگی کے شہوانیت کے مظاہرے ہوا کرتے تھے۔ مندروں کی مسماری میں دولت کے عنصر کا بہت ہی بڑا حصہ ہے۔ ایسا دیکھنے میں آیا کہ مندر ہی مسمار ہوئے یا کئے گئے جہاں کثیر دولت اکٹھا تھی۔ وہ ہمیشہ کشش کا کام کرتی رہی اور بادشاہوں کے دل کو موہ لیتی رہی۔ اس بات کی تصدیق ہمیں ہندوستان کے ان بھگتوں کی تعلیمات سے ہوتی ہے جنھوں نے زندگی کے اخلاق، عقائد کی درستی، اچھے چلن اور نیک نیت کے معیار کے سلسلے میں انسان کی زندگی کو خدا کا ایک گھر تصور کیا اور مندروں کو شیطان کا۔ ہمارے بھگت زندگی کی ایک نئی روشنی اور ڈگر کے متلاشی تھے۔ وہ دراصل اس زمانے کے رد عمل کا نتیجہ تھے۔ ان کی تعلیمات میں ہمیں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے حکمرانوں سے کوئی خوش نہ تھے۔ بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ حکمران ملک والوں سے کوئی خاص گہری دلچسپی نہیں

Marfat.com

رکھتے اور نہ خلق خدا کی فلاح و بہبود کا ان کے پاس کوئی خاکہ تھا۔ ان مجلسوں نے عظیم [illegible] بات کو عام کر دیا۔ حکمرانوں کو [illegible] جاگیریں دے کر [illegible] اپنی خود غرضیوں [illegible] گرفتار رکھا [illegible] اور ملک کی بھلائی پر [illegible] راستبازی اور صداقت۔

کہا جاتا ہے کہ مسلمان [illegible] رسول اسلام کے سب سے بڑے خادم گزرے ہیں۔ [illegible] کہ اسلام کے [illegible] معروف صوفیا [illegible] تھے [illegible] ملک کے [illegible] خطوں میں آکر بسے۔ ان کی زندگی کا مقصد ہی تھا [illegible] سے [illegible] گروں میں سے وظیفہ تھا جس سے اپنی زندگی خدا کی خدمت میں وقف کی اور ان کا ایمان اور یقین تھا [illegible] بندوں کی خدمت خدا کی خدمت ہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو درباروں سے دور اور بادشاہوں کے [illegible] سے بے پروا تھے بلکہ ان کو شاہی قوت و سطوت [illegible] سے [illegible] تھی۔ ان کا مرکز عوام تھا [illegible] شاہی [illegible] کہ وہ بادشاہوں سے [illegible] رکھتے تھے بلکہ ان کی [illegible] تاریخ [illegible] ظاہر کرتی ہے کہ وہ شاہی [illegible] بنانا نہیں چاہتے جس طرح بادشاہوں کی سطوت اور قوت سیاسی دنیا میں یکتا تھی اور مانی جاتی تھی ویسے ہی بزرگوں اور صوفیوں کی عزت عوام کے دل میں ممتاز درجہ رکھتی تھی۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بادشاہ

Marfat.com

کو ان بزرگوں کے پاس جانا پڑا اور ان بزرگوں نے شاہی مرکزوں میں آ کے اختیار کیا۔ تاریخ کی ورق گردانی سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ مسلمان حکمرانوں کی جانب سے اسلام کی تبلیغ نہیں ہوئی ہے چند مثالیں لوگوں کی یا خاندانوں کی مذہب کی تبدیلی کے سلسلہ میں ملتی ہیں ان کا تعلق در اصل اصلی مذہب کی تبدیلی سے اتنا نہیں ہے جتنا کہ سیاسی اور اقتصادی وجوہ سے۔ یہ ایک اصلی حقیقت ہے کہ ہر زمانہ میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو حکومت سے فائدہ اٹھانے کی خاطر حکمرانوں کے "مذہب" کو اختیار کرتے ہیں ایسا ہر زمانے میں ہوتا ہے جن کا تعلق تبلیغ اسلام سے نہیں بلکہ جذبہ ترقی اور اعزاز سے تھا۔ اگر مسلمان حکمران واقعی میں اسلام کی تبلیغ کرتے تو ان کے مرکز کی بیشتر آبادی مسلمان دکھائی دیتی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی راجدھانیوں میں جو مسلمان آبادی تھی وہ بیشتر غیر مسلم تھی یہ ہماری تاریخ کی عام شہادت ہے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں مسلمانوں کی بستیاں وہ تھیں جو شاہی مرکز سے کوسوں دور اور جہاں اسلام کے خادم صوفی بسے ہوئے تھے۔ انھوں نے اسلام کی خدمت کے سلسلہ میں جو کارہائے نمایاں کئے وہ در اصل امن کا پیام، انسان کی رواداری، خدا کے بندوں کی مساوات اور آپس کے بھائی چارہ کا پرچار رکھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی مرکز کا تختہ الٹا تو ہندوستان کی عام جنتا ہندو اور مسلمان نے امن قائم رکھا اور اکثر ایسا بھی سننے میں آیا

Marfat.com

کہ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ [illegible] گذشتہ زندگی [illegible]
ہیں۔ ان کی [illegible]
[illegible]
سے محروم تھی۔

[illegible]

[illegible] نظر آنے لگی [illegible]
ان کے [illegible] قانون اسلام [illegible]
کے راستے میں [illegible] کے خلاف شرعی رویہ میں تبدیل ہو گیا
اس کی ایک وجہ ہو گی۔

اب ہم اس گریز کے بعد ہندوستانی حکمرانوں کی سیاسی ذہنیت

Marfat.com

کی کہانی کو فیروز شاہ تغلق کے بعد سے شروع کرتے ہیں تغلق شاہی کے خاتمہ کے بعد ہندوستان میں افغانوں کا راج شروع ہوتا ہے۔ یہ افغانی راج اپنے عمل اور طریقہ کے اعتبار سے وسیع النظری کے اصول کو پیش نہیں کرتا کیونکہ افغان قبیلے دنیادارانہ ذہنیت رکھتے تھے اور ان کا دائرہ عمل بھی دنیادارانہ تھا۔ ان کی ذہنیت ان کے راج کے دور میں بھی نمایاں رہی۔ ملک گیری کی ہوس ان میں کافی سے زیادہ تھی۔ نظریہ اور خیال کی بلندی اور وسعت کی کافی کمی تھی جو دستور، قاعدے اور ضابطے بغیر حکومت سے قائم تھے ان ہی کو انھوں نے بحال رکھا۔ ان پر ہندوستانی ماحول اور فضا کا اثر کم پڑا۔ عملی سیاسیات میں ان کو بھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی۔ گو مسلمانی جوش و خروش ان کی طبیعت میں اکثر دیکھنا تھا لیکن حکمت عملی اور ریاست کاری کی مجبوریوں سے وہ اپنے مذہبی ولولوں کو عملی جامہ پہنا نہ سکے۔ اس افغان شاہی کی نمایاں شخصیت شیر شاہ سوری کی تھی۔

شیر شاہ سوری ہندوستان کے ان عقلمند، دوراندیش اور ریاستداں مدبر حکمرانوں میں سے ہے جس نے ملک کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسے کام کئے کہ اس کا نام ملک کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔ وہ ایک عملی انسان تھا اور اس لحاظ سے اس کا کل دور ایسی چھاچھوں کا آئینہ دار ہے جس سے ملک اور لوگوں کو انتہائی فائدہ پہنچا۔ اس کی دیہی اصلاحات مغلوں کے دور میں بھی قائم رہیں۔ شیر شاہ سوری نے

اپنی رعایا ہندو اور مسلمان کو ایک نظر سے دیکھا اور اس بات کا خیال رکھا کہ رعایا کے دل کو ٹھیس نہ پہنچائے یعنی ان کے مذہبی جذبات کو ٹھیس نہ لگنے دی۔ اس کی رواداری پالیسی کا نتیجہ تھا کہ ملک میں ہندو اور مسلمانوں کو مساوی انصاف اور درجہ ملا۔

اس سے پہلے کہ ہم مغلوں کا ذکر ختم کریں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس بات کا بھی ذکر کریں کہ مغلوں نے [illegible] ہندوستان میں کہاں تک کامیابی حاصل کی۔ جیسے جیسے [illegible] مسلمان [illegible] ان پھیلتے گئے ویسے ہی ان کے تعلقات [illegible] ہندوؤں سے بھی قریب تر ہوتے گئے۔ انہوں نے وقت کے ساتھ اپنی زندگی میں تبدیلی ہوتی ہوئی دیکھی یعنی وہ اپنے کو بدیسی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ملک کے اغراض ومقاصد سے گہری وابستگی اور دلچسپی لینے لگے یہاں تک کہ تھوڑے ہی عرصے کے اندر مسلمانی ریاست نام کو مسلمانی تھی لیکن وہ بالکل ہندی ہو گئی تھی۔ اس ہندی رنگ کے چڑھنے کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان حکمرانوں نے زیادہ تر ہندوستان کی عورتوں سے شادی بیاہ کئے تھے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تخت مسلمانی تھا لیکن محلات ہندی۔ [illegible] ہندوستانی اثر نے اپنا ہر طرح کا رنگ جمتا ہوا دکھایا۔ ہندوستان کے تہوارات، رسومات، رسمیں، طریقے اور طرحیں سب کی سب اپنے مختلف روپوں میں مسلمانی شاہی زندگی سے لیکر ادنیٰ مسلمان تک اپنی جھلکیں دکھا رہی تھیں۔ اس زمانہ میں جیسے کہ ہندوستان کی طرز زندگی اور اس کے

Marfat.com

اثرات نے مسلمانوں کو متاثر کیا تھا اسی طرح رفتہ رفتہ ہندوستان کے لوگ بھی مسلمانی اصولوں، نظریوں، عبادات، عادات، رسم و رواج، آداب اور تہذیبی قوتوں سے اثر لینے لگے۔ اپنی زندگی میں نیا پن، نیا ڈھنگ، نئی روش اور نیا طرز محسوس کرنے لگے۔

حکمرانوں کے مقاصد کی کامیابی محض سیاسی قوت کی بنا پر نہیں ہوئی بلکہ اس میں ہندوستانیوں کا بھی ہاتھ تھا جو اپنے ملک کی ترقی اور زوال کے ساتھ اٹھتے بیٹھا کرتے تھے۔ مرکزی حکومت سے خاص طور سے حکمرانوں نے ہندوستان کے علاقوں کو الگ کیا۔ لیکن یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ جتنی بھی دولت ان کے ہاتھ آئی وہ زیادہ تر اسی ملک میں خرچ ہوئی۔ وہ دولت ہندوستان سے باہر نہیں گیا جیسا کہ انگریزی راج میں ہندوستان کی دولت باہر جاتی رہی۔ اس دولت کا صرفہ جس اعتبار سے بھی کیا گیا اس کی ذمہ داری زمانے کی ذہنیت، اس کے رجحان اور اس کے تقاضے پر رکھی جا سکتی ہے۔ اس دور کی صنعتی اور فنی ترقی میں حکمرانوں نے جو صرفہ اتنا دولت صرف کی وہ ایسا کارنامہ ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندوستان سے باہر نہ گئی۔ اس دولت کے لگنے کی وجہ سے پہلے ہی نہیں بلکہ اپنے فن کا راستہ صنعتوں کو ترقی دی ویسے سکے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کے گوشہ گوشہ میں صنعت و حرفت بڑھتی گئی اور ہندوستان کی شہرت دنیا میں ایک اعلیٰ صنعتی اور فنی مرکز کی حیثیت سے پھیل گئی۔ ہندوستان کی اس ناموری

گیارھواں باب

مغل دور کے چند ممتاز بادشاہوں کی تمدنی خصوصیات

مغلوں سے قبل کے ہندوستان میں سماجیاتی قوتیں آپس میں ٹکرا کر ملیں اور الگ بھی ہوئیں۔ قدیم ہندوستان کی زندگی کا سلسلہ بے روک ٹوک اپنی رفتار کو نئے اثرات کے رنگ میں کبھی شوخ اور کبھی مدھم پڑتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ پرانا ہندوستان اپنے رسم و رواج، اپنی ریت، اپنے قاعدے، اپنی طبیعت اور اپنے رجحان کو ساتھ لے کر ایک بدلتے ہوئے زمانہ سے گزرتا اور اپنے میں رفتہ رفتہ نئی اسپرٹ، نئی قوت، نیا انداز، نیا طرز اور نئی فکر محسوس کرتا تھا۔ ان تمام سماجیاتی قوتوں کا اثر ہمارے ملک میں ایک دم سے ظاہر نہ ہوا کیونکہ جب کسی ایک ملک کی تہذیب اور اس کا تمدن کسی دوسرے ملک کی تہذیبی اور تمدنی قوتوں سے ٹکراتی ہے تو ملک کی زندگی کی شکلوں کے نکھرنے میں یعنی نئے اداروں اور

Marfat.com

طریقوں کے بننے میں اور عادتوں اور رویوں کی تبدیلی میں، وقت لگتا ہے۔ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی خصوصیت یہی رہی مغلوں کے پہلے حکمرانوں نے جو کچھ بھی کیا اس میں سیاست کاری اور راج نیتی کا زیادہ اثر دکھائی دیا نہ کہ تہذیبی قوتوں کا۔ اس میں شک نہیں کہ ان حکمرانوں میں سے چند ایسی ہستیاں گزری ہیں جن کے ہاتھوں ہندوستان کی بھلائی کا مسلک پروان چڑھا اور ایک اعلیٰ تہذیبی مقام پر بھی پہنچا۔ گو انھوں نے ہندوستان کی تہذیب ایک کل ہندی پیمانہ پر نہ کی لیکن ملک کے مختلف حصوں میں ہندو مسلمانی رجحانوں کے تحت تہذیبی قوتیں ترقی پا رہی تھیں۔

مغل دور میں دراصل اس بات کا چرچا اور پرچار رہا کہ ہندوستان کی جانچ پڑتال، تعمیر اور پرداخت، بناؤ اور سجاؤ، کل ہندی تہذیبی نقطۂ نظر سے کی جائے۔ اس لحاظ سے ہمارے ملک کی تاریخ میں اس کو ایک خصوصی امتیاز حاصل رہا۔ اس امتیاز اور خصوصیت کی وجہ مغلوں کی ذہنیت اور رجحان تھا۔ سیاسی، سماجی اور تہذیبی مسئلوں کے سمجھنے میں انھوں نے انسانی مسلک اور اصول کو برتا۔ عہد وسطیٰ کے تمام حکمرانوں میں مغل حکمران ہی وہ لوگ تھے جن میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ معاملات کو انسانی نظر اور ہمدردی سے دیکھ سکیں۔ ان کی تمام تر کوششیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ انھوں نے ہیئت کی کارفرمائی اور ان کے عمل کا دائرہ بڑا اور وسیع تھا پر کام کی انجام دہی میں اس عملی

کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس خاندان کا آغاز بابر سے ہوتا ہے جو بہادری جفاکشی، سپاہگری، علمی ذوق، قدرت پسندی، انسان دوستی اور ہمدردی جیسے انسانی خوبیوں کا ایک زندہ نمونہ تھا۔ اس کی شخصیت کے مختلف روپوں کا اندازہ "تزک بابری" سے بخوبی لگتا ہے۔ اس کی زندگی آزمائش اور جستجو کی یادگار ہے مصیبتیں، تکلیفیں اور کٹھنائیاں بابر کی زندگی میں تہذیبی سہاگے کا کام دے گئیں۔ گو بابر نے ہندوستان پہ تھوڑے عرصہ ہی حکومت کی، لیکن اس کی سیاسی نظرت اور انسانی نظر نے بھانپ لیا کہ ہندوستان میں مغل حکومت کا استحکام اور پائیداری محض جہانگیری قوت سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے ذریعے حکومت کی بنیادیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ ایسی بے بنیاد حکومت کا شیرازہ جلد سے جلد بکھر سکتا ہے۔ اس کو اس بات کا یقین ہو چلا تھا کہ مغل راج ایک اصلیت ہو جائے گا۔ ایسے راج کے قیام اور اس کے استحکام میں بابر کی انسانی قوت اس کی رہنما ہی نہ بنی بلکہ مغل حکمرانوں کی انسان پسندی بھی کام آئی۔ شروع شروع میں بابر کو اس ملک سے نہ کوئی ہمدردی تھی اور نہ دلچسپی۔ نہ اس ملک کی فضا نے اس کو متاثر کیا اور نہ اس کے لوگ اور اداروں نے اس کے دل کو موہ لیا۔ وہ اجنبیوں کے ملک میں اپنے کو فاتح سمجھتا تھا لیکن بابر کی انسانی فطرت اور نظر کا یہ کارنامہ تھا کہ اس نے اجنبیوں کو اپنا لیا۔ اس نے وہ کام انجام دیا جو مغل کارنامہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "تزک بابری" میں اس نے اپنی اور ہندوستان

کی سچی تصویر کھینچی ہے جس کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان میں تبدیلی کیونکر ہوتی ہے۔ بابر کے آخری زمانہ میں ہندوستان نے اس کے دل میں جگہ کی اور اس کو یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ ملک نفرت کے قابل نہیں بلکہ اپنا ہوسکتا ہے۔ جیسے جیسے اس کی زندگی کے دن اس ملک میں بیتتے گئے ویسے ویسے وہ ہندوستان کی اصلیت اور خوبی سے مرعوب ہوتا گیا۔ بابر اور گورو نانک کی ملاقاتیں اس امر کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جو عزیز رکھا جاسکتا ہے۔ گورو نانک نے اس کو راج نیتی میں سبق دیئے، جہانگیری کے کھوکھلے مسلک کے راز کو فاش کیا اور یہ واضح کی کہ ملک گیری اور خوں ریزی انسان حکمرانوں کا طرۂ امتیاز نہیں ہوسکتا اور اگر وہ اور اس کا خاندان اس ملک پر حکومت کرنا چاہتے ہیں تو ملک والوں کے ساتھ انصاف اور محبت کے رشتہ کو جوڑنا ہوگا۔ روایت یہ بتاتی ہے کہ بابر گرو نانک سے بے حد مرعوب ہوا۔ ممکن ہے کہ ان ملاقاتوں کے نتیجہ کے طور پر بابر کے دل کی آنکھ کھلی ہو اور اس نے جو رویہ ملک والوں کے ساتھ اختیار کیا اس کی شہادت اس شاہی دستاویز میں موجود ہے جو ہمایوں کے نام بابر کی وصیت میں ملتی ہے۔ یہ وصیت ریاست بھوپال کے نواب صاحب کے کتب خانہ میں آج بھی موجود ہے اس وصیت کی اصلیت کے متعلق تحقیق کرنے والوں نے چھان بین

Marfat.com

کی اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ وصیت جعلی نہیں بلکہ اصلی ہے۔ اس وصیت کا گہرا مطالعہ بابر کی شخصیت کو نئے نقطۂ نظر سے جانچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اگر اس وصیت کو اصل مانا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ بابر نے مغل حکومت کی داغ بیل انسانی اصولوں پر رکھی تھی اور اپنے آنے والے وارثوں کو ہدایت کے طور پر جہانبانی اور تہذیب کا ایک نیا راستہ بھی دکھایا تھا تاکہ مغل راج ایک نیا راج بن سکے۔ ہم اس نقطۂ نظر سے اس باب کے دوران میں مغل حکمرانوں کے کارناموں پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے اور بتائیں گے کہ ہر مغل حکمراں کسی نہ کسی اعتبار سے "بابری حکم" پر کاربند رہا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ بابر نے یہ وصیت اس غرض سے چھوڑی کہ اس کا راج ایک مثالی راج ہو تو ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بابر محض ایک سپاہی، ایک ادیب یا ایک فطرت پرست انسان ہی نہیں بلکہ ایک دوراندیش، سمجھدار، ذی فہم، روشن خیال مفکر بھی تھا۔

بابر کی وصیت ہمایوں کو جو ہدایت دیتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکمرانی کے معنی ایک من مانی راج کے نہیں بلکہ اس راج کے ہیں جس میں ایک نرتہ دارانہ شاہی فکر اور عمل کے لحاظ سے ہو۔ بابر کی نظر میں راج کرنے کے معنی دقتیہ راج کے نہیں بلکہ اس راج کے تھے جس میں ملک کی بھلائی، انسانوں کی خوشحالی، ملک کا امن و امان، کامل انصاف، عام رواداری اور دادرسی، ظلم سے حفاظت بھی ہو۔

Marfat.com

وہ راج ہو جس میں حاکم اور محکوم کا رشتہ تلوار کی بنا پر نہ جڑے بلکہ ان انسانی قوتوں پر رکھا گیا ہو جن کی مدد سے ملک اور لوگوں میں امن اور خوش حالی، بھلائی اور نیکی پھیل پھول سکے۔ حکمرانی سے متعلق یہ وہ ہدایت تھی جو بابر نے ہمایوں کو کی کیونکہ ایسے شاہی رویہ اور عمل سے حکومت میں پائیداری اور دیرپائی پیدا ہو سکے گی۔ ان تمام اصول حکمرانی کے علاوہ اس وصیت میں حکومت کی تعمیر کے سلسلہ میں ان تدبیروں کا بھی ذکر ہے جو ہمایوں کو اختیار کرنی ہوں گی اگر وہ ہندستان میں مغلیہ راج قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں بابر لکھتا ہے کہ ہندستان ایک ایسا ملک ہے جہاں مختلف نسل کے لوگ آباد ہیں اور جن کے مذہب الگ الگ ہیں۔ ان کی رسومات اور رسمیں بھی مختلف ہیں جن کی زندگیاں ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ ہندوستان مختلف قسم کی تہذیبوں اور جمعیتوں کا گہوارہ ہے۔ ایسے ہندوستان میں ایک حکومت کیوں کر کامیاب ہو سکتی ہے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب بالواسطہ بابر یوں دیتا ہے کہ ایسے ملک کو تلوار کے زور سے فتح کرنا آسان ہے لیکن ہند واسیوں کے دلوں پر تلوار سے حکومت نہیں کی جا سکتی اور ایک نیا قانون اور ایک نیا رویہ لاحق ہوتا ہے اور وہ فضل سمجھو، رواداری اور ہمدردی کا ایک نیا راستہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس نسلی نظر اور جذبہ کو اس نے اس طرح سمجھایا کہ ہندوستان دراصل ایک ایسا ملک ہے جس میں کائنات کی طرح مختلف موسمی عناصر موجود ہیں جن

Marfat.com

طرح قدرت میں موسمی عناصر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہوئے اپنی ادا، اپنی فطرت اور بھاؤ، اپنی یکتائی اور اپج کاری کی نمائش کرتے ہیں اور کائنات کے بنانے میں اپنا اپنا حصہ لیتے ہیں، اس طرح ہندوستان کے مختلف نسل، روپ اور مذہب کے لوگ کل ہندوستانی زندگی کے الگ الگ پہلو کو ظاہر کرتے ہوئے اور اس حقیقت کو نمایاں کرتے ہیں کہ ہندوستان کے لوگ اور مذہب ہندوستانی زندگی کی بناوٹ اور اٹھان میں اپنی اپنی ادائیں، اپنے اپنے رنگ، اپنا اپنا خیال، اپنا اپنا انوکھا پن پیش کرتے ہیں اور اس طرح اپنی وحدت اور یکتائی کو مجموعی طور پر کل ہندی زندگی میں کائنات کے موسمی عناصر کے عجائبات کی طرح ہندی تہذیب اور سبھیتا کو جنم دیتے ہیں۔ بابر کے اس خیال میں معاملات کے سمجھنے اور سلجھانے میں ایک کل ہندوستانی زندگی کی حقیقت نظر آتی ہے۔ بابر کی نظروں میں ہندوستانی زندگی ایک جبلی مظاہرہ نہیں بلکہ کائنات کی طرح وہ اپنے میں جیون بھرپور قوت رکھتی ہے جس کی ترقی کی رفتار میں ظلم اور خلاف انسانی عمل اور حرکت سے رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہے مگر اس کی نشوونما نہیں ہو سکتی اس کی ترقی کا راز اس میں مضمر ہے کہ انسانی اصولوں کو ملک کی عام زندگی میں مقام حاصل ہو۔ اس طرح ہندوستان کی کل زندگی کی ترقی کا سوال ایک سماجیاتی یا سبھیتا کا سوال بن جاتا ہے۔ ملک کا ہر شخص اس وقت تک اپنی ترقی نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ ملک کی

Marfat.com

تمام ترقی کے ساتھ ساتھ اپنا قدم نہ اُٹھائے۔ ہر مذہب کل ہندُستان کے ایک جزو کی حیثیت سے یا ہندوستانی زندگی کی اتحادی قوتوں میں ضم ہونے کے بعد اس وقت تک ہندی اصلیت کو حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ کائنات کے کرشموں کی طرح جزو اور کل آپس میں "فنا" نہ ہو جائے۔ اسی خیال کی مزید توضیح بابا نے یوں کی کہ ہندوستانی مختلف رسم و رواج اور طور و طریق کے پابند ہیں۔ اس لئے حکومت کو اس ہندوستانی زندگی کا لحاظ رکھنا بے حد ضروری ہے اور حاکمِ وقت کی دانشمندی اس میں ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی کو ہمدردانہ مگر غیر متعصبانہ نظر سے دیکھے اور اس بات کی کوشش کرے کہ اپنی زندگی کو کل ہندی زندگی میں ڈھالتے ہوئے اس تہذیبی فرق کو جو حاکم اور محکوم کے درمیان ہوتا ہے یگانگت اور ہم آہنگی کے جذبہ سے مٹا دے۔ اس عمل سے راج میں راجا کی بدیسیت جو پرجا کے بیچ میں حائل ہوتی ہے دور ہو جاتی ہے، حاکم محکوم سے قریب تر ہو کر ملکی بن جاتا ہے اور ملکی سانچے میں ڈھلنے کے بعد ہی ملک کے لوگوں کی طبیعت، ذہنیت، مزاج، عادت اور طریقوں کو وہ صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے اور ملک میں ایک دیسی سا حکومت قائم کر سکتا ہے۔ رعایا کی زندگی پہ شاہی کا ایسا طرز ایک خوشگوار ردعمل کا حامل ہوتا ہے جس کا نتیجہ راج اور راجا کے ساتھ وہ وفاداریاں ہیں جو ملکی جذبوں اور خیالوں سے پیدا ہوتی ہیں۔ اسی ضمن میں بابا نے

Marfat.com

اس امر کو بھی صاف کر دیا کہ ملک میں نفرت کی آگ کو نہ بھڑکایا جائے بلکہ اس طرح بجھایا جائے کہ حاکم پر عوام کے تعصبات اور توہمات کا پاس و لحاظ ہو۔ دوسرے لفظوں میں بابر یہ کہنا چاہتا ہے کہ باوجود ایسے تعصبات توہمات کے جو حاکم کی طبیعت کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں۔ رعایا کے دل کو ٹھیس نہ لگے۔

اس وصیت میں بابر نے ہندوستانی زندگی کے ایک دوسرے پہلو کو بھی دکھایا ہے جس کا تعلق صرف ہندوستان کے مسلمانوں سے تھا۔ بابر کو یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوا کہ مسلمانوں کے آپسی میل جول اور اتحاد میں بے حد کمزوری اور خامی ہے۔ ان کی زندگی بھی فرقوں کی بندش میں جکڑی ہوئی ہے۔ وہ اسلام کے قانون کے پورے پابند نہیں ہیں۔ "تزک بابری" میں ایک جگہ یہ واضح کیا کہ ہندوستان کے مسلمان مسلمان نہیں ہیں اور قرآن اور رسولؐ کے احکام پر نہیں چلتے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی ایک وجہ ہندوستانی مسلمانوں کی بدعتی زندگی بھی تھی۔ اس وصیت میں بابر ہمایوں کو عام مسلمانی زندگی کی اسی خامی سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ سنیوں اور شیعوں کی آپس کی دشمنائی جو ہندوستانی مسلمانی زندگی میں بھی نظر آئی اس وقت تک دور نہیں ہو سکتی جب تک کہ یہ دونوں فرقے آپس میں رواداری اور دوستی نہ برتیں۔ ان میں تلوار کے زور سے محبت اور اتحاد پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں بابر نے مسلمانی عالمی زندگی کی ایک تاریخی اور سماجیاتی حقیقت کو پیش کر کے اپنے دل کے جلے پھپھولے پھوڑے ہیں

Marfat.com

ہمایوں کو اس بات کی تاکید کی گئی کہ جب ہندوستان کے تخت پر بیٹھے تو وہ مسلمانی زندگی کے اس عیب اور دھبے کو اس طرح مٹائے کہ خلش اور دشمنائی کی بجائے آپس کا اتحاد اور محبت قائم ہو سکے۔

اس وصیت کی آخری ہدایت اس بات پر زور دیتی ہے کہ ایک حکمران کے لئے لازم ہے کہ وہ تلوار کو حکمرانی کا شعار تصور نہ کرے۔ جب تک اس میں ایسا احساس پیدا نہ ہو کہ اس کا راج لوگوں کے دلوں پر حکومت کرنے کے لئے قائم ہوا ہے اس وقت تک تلوار کی حکومت کا دور دورہ رہے گا۔ یہ ایک مانا ہوا بنیادی سیاسی اصول ہے جس کی وضاحت بابر نے اپنی وصیت میں کی اور جس سے اس کا ایک سیاسی مفکر ہونا سمجھا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ وصیت ایک سیاسی دستاویز یا سیاسی رہنما ہے۔ اس وصیت میں دو اصولوں کو مجموعی اعتبار سے پیش کیا گیا ہے۔

(۱) حکمران کی تہذیب میں ملک کے حالات کا عمل دخل۔

(۲) راج اور جنتا کی بھلائی میں ملک کی ترقی۔

بابر کی وصیت پر اس کے بیٹے ہمایوں کو عمل پیرا ہونے کا کافی موقع نہ ملا، گو اس نے اپنے راج کے تھوڑے ہی زمانہ میں ہندوستانی رجواڑوں کے ساتھ نئے تعلقات کی بنا ڈالی۔ ہمایوں کی حکمرانی ایک اعتبار سے نئی نئی تجربوں کی حامل تھی۔ بحیثیت انسان کے اس کو

Marfat.com

کھوج لگانے کا بیحد شوق تھا۔ اس نے نئے نئے میدانوں میں ایجادیں کیں۔ وہ ایک اچھا خاصا عالم بھی تھا اور اس کو میکانی فن کاری سے بھی بیحد لگاؤ تھا۔ ہمایوں کو سیاسی انقلاب کی وجہ سے ایسا موقع نہ مل سکا کہ وہ اپنے باپ کی ہدایت پر پورے طور سے چل سکے۔ لہذا بابر کے بعد جس مغل حکمران نے بابر کی وصیت پر عمل کیا وہ اس کا پوتا اکبر اعظم تھا اکبر کا مرتبہ ہندوستان کی تاریخ میں ایسا ہی ہے جیسا کہ اشوک کو قدیم زمانہ میں حاصل ہوا تھا۔ ان دونوں کے مسلکوں میں ہم آہنگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ان دو نادر حکمرانوں نے اپنے اپنے منصوبوں اور نظریوں کے پورا کرنے میں مختلف تدبیریں اختیار کی تھیں۔ وہ ہندوستان کی سیاسی یکتائی کے علاوہ، اس کی کلچری یکتائی میں بھی مدد دیتی رہیں۔ ان دونوں کا مسلک ہندوستان کی یکتائی تھا۔ ایک بڑے ہندوستان (ہندوستان اعظم ؛ GREATER INDIA) کے خیال کے مالک اشوک اور اکبر تھے۔ ان کے ذہن اور دل میں جس ہندوستان نے اپنا نقش جمایا تھا۔ وہ وہ ہندوستان تھا جو اتحادی قوتوں اور میل ملاپ کے جذبے سے بنا تھا اور جس کی اصلی قوت تلوار نہیں تھی بلکہ انسانی تعلقات کا فطری اثاثہ تھا۔ ہندوستان کے علاقوں کو محض جیت کر، ان کو دبا کر، یا کچل کر، یا غلام بنا کر حکومت کرنا نہ اشوک کا اصول تھا اور نہ اکبر کا منصوبہ یا خواہش۔ ان دونوں نے ہندوستان کی دنیا میں انسانوں کے رشتوں کو پریم اور ہمدردی سے

Marfat.com

مضبوط کیا اور اس طرح سیاست کی بنیاد کلچر پر رکھی۔

اگر اکبر کا مقابلہ ہندوستان کے دوسرے مسلمان حکمرانوں سے کیا جائے تو یہ بات بالکل صاف طور سے واضح ہو جائے گی کہ جن سماجیاتی سلسلوں کی ابتداء ان کے دور حکومت میں مختلف جذبات اور خیالوں کے تحت ہوئی۔ ان کی تکمیل اکبر کے ہاتھوں ہوئی۔ خیالوں اور اصولوں کی وسعت، گہرائی اور بلندی میں اکبر ان تمام حکمرانوں سے سبقت لے گیا۔ یہ کہنا اور زیادہ صحیح ہوگا کہ اکبر نے اس سے قبل کے دور کے تعمیری اور اتحادی رجحانوں، کاوشوں اور جدوجہد کو وسیع تر کیا تاکہ ہندوستان کی تعمیر ہندوستان کی طبیعت کے موافق ہو۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا نامناسب نہ ہوگا کہ اکبر نے وسطائی ہندوستان کی زندگی کی خامیوں اور قدامت پسندیوں کو دور کرکے ایک نیا صلح کل ہندوستان کھڑا کیا۔ اکبر خود صلح کل انسان تھا اور اس نے صلح کل نظریوں اور اصولوں کو عام ملکی زندگی میں ایسا سمویا کہ مغلیہ دور اکبری اثر کا رہین منت تھا۔ اکبری صلح کل اصول پُر امن زندگی کا ایک اہم ترین ترقی پسند اصول ہے جو اپنے میں ان گنت تعمیری قوتیں رکھتا ہے۔ اسی خیال سے اکبر متاثر ہوا تھا اور اس کی زندگی کی کوششیں یہی تھیں کہ ہندوستان امن کے تعمیری اور طاقتور قوتوں کی اہمیت کو سمجھے اور ان پہ چلے۔ اکبر خوب جانتا تھا کہ امن اپنے دائرہ کے پھیلاؤ کو ملک میں اس وقت تک ترقی نہیں دے سکتا جب تک کہ ہندوستانی اپنی زندگی میں اس کا اثر

Marfat.com

نہ لیں۔ اس لحاظ سے امن محض ایک لفظ نہ تھا بلکہ وہ خود کل زندگی کی ایک قوت ہے یا زندگی کے وہ دل کش روپ ہیں جو انسان کو آپس میں میل ملاپ کے رشتے میں جکڑ کر اپنی یکتائیوں کو بحال رکھتے ہیں۔

ویسے تو صلح کل کا اصول اس زمانہ کے ہندوستان کے لئے ناممکن تھا لیکن اس دنیا کی تخریبی قوتوں کو اگر بے دم کیا جا سکتا تھا اور عام زندگی میں نیا جوش اور نئی امنگ پیدا کی جا سکتی تھی تو وہ وہی امن کا صلح کل اصول ہو سکتا تھا جو اکبر اعظم نے ہند واسیوں کو دیا۔ اکبر گو ایک شدھ بدھ پڑھا لکھا انسان تھا (کہا یہ بھی جاتا ہے کہ وہ ان پڑھ تھا) لیکن باوجود اس کم علمی کے وہ ایک ایسا روشن خیال انسان تھا جس کی نظر زندگی کی اصلیت پر پڑتی تھی اور اس کے دھوکے اور فریب کو چاک کر دیتی تھی۔ یہ اکبر کی فطری صلاحیت تھی۔ جیسے جیسے اس کی طبیعت میں صلح کل کا قانون جگہ کرتا گیا ویسے ویسے اس کی چھپی ہوئی شخصیت ابھرتی گئی اور اپنے انسانی کمال کے جوہر دکھانے لگی۔ اکبر کی بڑائی اور اس کی عظمت اسی انسانی ترقی کے کرشمہ میں تھی جس کے اثر میں زمانہ اور لوگ آئے۔ غور و فکر کے بعد اکبر اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستان ایک بہت ہی پرانا ملک ہے جہاں کے باشندے پرانے طرز کے ہیں وہ رسم و رواج میں پرانے ہی نہیں بلکہ عادتوں اور خیالوں میں بھی پرانے ہیں۔ ان کے دل و دماغ کی ساخت اور بناوٹ بھی ٹھیٹ

Marfat.com

قدامت پسندانہ ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ ہندوستان کے لوگ مختلف مذہب و نسل کے ہیں۔ ان کے سانچے اور کسوٹیاں بھی الگ الگ ہیں یعنی لوگوں کے مذہبی، اخلاقی، سماجی یا سماجیاتی زندگی کے اصول بھی مختلف ہیں۔ دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی دنیا میں چھوٹی چھوٹی اور بڑی بڑی حکمرانیاں بھی تھیں جو ایک دوسرے سے ٹکرایا کرتی تھیں۔ بعض مرتبہ تو وہ آزمایش میں کامیاب ہوتی تھیں اور کبھی ناکام بھی۔ ہر راج چھوٹا یا بڑا ایک دوسرے کے زور کو توڑنے یا بیجا فائدہ اٹھانے پہ تلا ہوا تھا۔ اس قسم کی سیاسی بے چینی اور جھگڑے ہندوستانی زندگی کے امن میں حائل ہو رہے تھے اور کل ہند سیاسی مرکز کے لئے خطرہ کا باعث تھے۔ ان رجواڑوں کی سیاسی کوتاہ نظری، جاگی مقامی وفاداریاں یا تنگ حلالیاں اور سیاسی اغراض ہندوستان کو ایک مضبوط سیاسی مرکز بنانے میں ہمیشہ رکاوٹ بنتے رہے۔ یہ ایسا سوال تھا جس سے اکبر کو دوچار ہونا پڑا۔ جب تک کہ ان دو مسئلوں کا حل دریافت نہ ہو جائے اس وقت تک مغل حکومت یا راج اکبری نقطۂ نظر سے کامیاب نہ ہو سکے گا۔ اکبر نے ان سیاسی مسئلوں کے حل میں صلح کل کے اصول کو بہت ضروری سمجھا۔

ہندوستانیوں کی زندگی میں صلح کل کے فلسفہ کی اہمیت اس طرح واضح کی گئی کہ امن انسانی ترقی کی جان ہے۔ وہ محض ایک مردہ خیال یا جذبہ نہیں بلکہ وہ قوت ہے جو حرکت میں آنے کے بعد انسان کے دل و دماغ

Marfat.com

میں انقلاب پیدا کرتا ہے۔ اکبر کا یہ خیال کہ ہندوستانی زندگی انقلاب کے جھٹکوں کو محسوس کئے بغیر امن کی قوت سے ترقی کر کے راستہ پر لگ جائے گی۔ ایک سادہ مگر پر اثر اصول تھا کیونکہ اس کا وجود ہندوستان جیسے بڑے ملک کے لئے ناگزیر تھا۔ اگر انسان صلح کل کے فلسفہ کی اہمیت کو نہیں سمجھتا تو وہ اپنی زندگی کی اہمیت کو بھی نہیں سمجھتا کیونکہ انسانی زندگی کا اٹھاؤ، بڑھاؤ اور ابھار، در اصل برباد کرنے والی قوتوں سے نہیں ہوتا۔ انسان سماج اور ملک یہ سب کے سب اسی وقت انسانی قوتوں کو ترقی دے کر اپنے میں میل ملاپ اور رواداری کے اصولوں کو جگہ دے سکتے ہیں جب کہ صلح کل کا فلسفہ عملی جامہ نہ پہنے۔ اکبر اسی نظریہ کا حامل تھا۔ ہندوستان کی ان گنت جاتیوں اور طبقوں کو کلچری یکتائی کے رنگ میں رنگنے کی کوشش صلح کل کے پیام کی آواز تھی۔ ہندوستان کے مختلف کلچری نظام میں لانے کے معنی یہ تھے کہ عام ملکی زندگی امن پسند کیفیتوں کو پیش کرے گی۔ جھگڑے اور فساد، نفاق اور دشمنی، فرق اور امتیاز سے ہٹ کر مغل دور میں اس صلح کل اصول کا عملی اثر جو دکھائی دیا وہ ہندی مغل خیال اور زندگی کی ایک زندہ مثال ہے۔ ہندوستانی زندگی کے روپ اور اس کی ادائیں، اس کے طریقے، اس کی طرحیں، اس کی نزاکتیں، مغلوں کی نمایاں خصوصیت بن گئیں اسی کے ساتھ ساتھ عام ملکی زندگی پر ایک مغل تہذیب کا چربہ بھی چڑھنے لگا۔ اس طرح مغل حاکم اور ہندی محکوم دونوں میں یگانگت

Marfat.com

پیدا ہوئی اور اتحادی قوتیں ترقی پسند نقطۂ نظر سے پھیلتی ہوئی ملک کی زندگی کو متاثر کرنے لگیں۔

اکبر نے صلح کل پیام کی دعوت ہندواسیوں کو دی۔ وہ ایک نئی ہندی زندگی تھی جس کی تعمیر سمجھ اور فہم، ہمدردی اور رواداری کے اصول پر تھی۔ اس لحاظ سے اکبر نے بابر کی وصیت کے "خیال" کو ہندوستانی انسان کی جیتی جاگتی زندگی میں عمل سے بدل دیا۔ اکبر اس بات کو خوب سمجھ چکا تھا کہ انسانی یکتائی کی جڑ در اصل صلح کل زندگی کا اصول ہے۔ انسان جو نسلوں، رنگوں یا مذہبوں کی تقسیم میں یقین رکھتا ہے وہ نہ صرف اس خیال کو سمجھ ہی نہیں کرتا بلکہ اس کو بے دم بھی کر دیتا ہے۔ وہ انسانی ارتقاء کے قانون کو بھی نہیں سمجھتا۔ دنیا میں انسانی روپ مختلف نظر آتے ہیں لیکن انسان کی اصلیت ہر جگہ ایک ہے۔ انسانی طریقے، عادتیں رسم و رواج، ریتیں اور رویے ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں لیکن ان سب کے پیچھے ایک ہی انسان کی ذات اور اس کا قانون کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اسی خیال کو بابر نے اپنی وصیت میں کائنات اور انسان کی ہم آہنگی کے قانون میں واضح کیا تھا جس کو اکبر نے اپنے زمانہ میں صلح کل کے قانون سے تعبیر کیا تھا۔ اس نے انسانوں کے فرق کو نہ مانتے ہوئے اس دعویٰ کو پیش کیا کہ تمام انسان ایک ہیں اور مذہبوں کی ظاہری تقسیم میں ایک ہی عالمگیر مذہب کا قانون کام کرتا ہے انسانی قانون سے اونچا اور اتم کوئی دوسرا قانون نہیں ہے۔ اکبر کی

Marfat.com

کل سمجھ اور نظر میں انسانی قانون کی ترقی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ انسان اپنی پنہاں قوتوں سے آگاہ ہو جائے اور وہ اس بات کے درپے ہو کر ان کی پرداخت کر سکے۔ سوائے اس کے اکبر اعظم کا زاویۂ نظر کچھ نہ تھا کہ انسان کو سماجوں اور مذہبوں کے جھوٹے فرق بتائے اور انسانی برادری کے اصولوں پہ انسان کی سماجی زندگی کی تشکیل ہو۔ انسانی اتحاد اور یکتائی کا سوال محض انسان کی قوت اور اس کی سوجھ اور سمجھ پہ اتنا منحصر نہیں جتنا کہ سماجیاتی قوتوں کے میل ملاپ پہ ہے۔ انسان کی تہذیبی ترقی اسی راستے سے ہو سکتی ہے بشرطیکہ سماج اور مذہب کے عالمگیر اصول کا دود دودہ ہو' ورنہ مذہب اور سماج کے امتیازی اصولوں سے انسان اور انسان میں جو فرق پیدا ہوتا ہے وہ پاٹا نہیں جا سکتا۔

اکبر ایک سچے مذہب کا ماننے والا تھا جس کے دل میں صداقت اور حق کی آگ لگی ہوئی تھی۔ گو زمانہ کی تاریخ لکھنے والوں نے اس کو بے دین بتایا ہے (مذہبی کوتاہ نظری اور تعصب کے اعتبار سے وہ ضرور لامذہب تھا) لیکن اکبر کی جانچ اگر اس معیار سے کی جائے جو دنیا کے بڑے دھرم ویروں نے سچے مذہب کے پانے میں کیں تو اس کو بھی وہی مرتبہ حاصل ہوگا جو سچے مذہب کے راستے پر چلنے والوں کو ملا۔ اکبر نے مذہب کی صداقت کی جستجو میں عقل اور سمجھ کو دخل دیتے ہوئے اصلی مذہب کو دنیا کی آنکھ سے دیکھا اور پایا۔ اس زمانہ سے

مولوی اور قاضی اکبر کی تلاش حق کی جستجو کے مفہوم کو نہ سمجھے۔ ان کے نزدیک مذہب کے معنی صرف کتابی مذہب کے ہو سکتے تھے۔ یہ وہ کتابی مذہب ہے جس سے انسان کے دل میں تنگ نظری، تعصب، فرقہ واریت، پھوٹ اور نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اکبر کی لڑائی مولویوں اور قاضیوں سے رہی اور ان ہی لوگوں نے اکبر کو بدنام کیا۔ مناظرے جو مذہب کی بھلی کھوج کے سلسلے میں اکبر کروایا کرتا تھا وہ اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس کا مقصد یہ نہ تھا کہ وہ دیکھے کہ کس فرقہ کی جیت ہو کس کی ہار بلکہ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ دنیا کے مذہب انسان کو کس طرح ایک راہ پر لگا سکتے ہیں۔ جیسے جیسے مناظروں کی گرما گرمی اور بحث و تکرار کے جوش میں پنڈت اور مولوی اپنے کٹرپن کو ظاہر کرتے جاتے تھے ویسے ہی اس نے ایک مرتبہ بحث و مباحثہ کے دوران میں مذہب کے عالموں سے ایک سوال کیا کہ کیا خدا کا تصور انسان کے ساتھ پیدا ہوا اور کیا ایمان اس کا فطری ہے؟ جواب میں یہ کہا گیا کہ ایسا ہی ہے۔ اکبر نے اس خیال کی تردید یوں کی کہ انسان خدا کے تخیل کو پیدا کرتا ہے نہ کہ وہ انسان کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ اس خیال کی تصدیق اس نے ایک تجربہ کے ذریعہ کی کہ ایک قلعہ میں بہت ہی کم عمر کے پانچ بچوں کو بند کروا دیا اور حکم دیا کہ ان کی جان کی حفاظت کی جائے لیکن ان سے کوئی مذہبی بات چیت نہ کی جائے۔ پانچ سال کے بعد یہ بچے دربار میں لائے گئے اور اکبر نے مذہبی عالموں کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ ان سے

Marfat.com

دریافت کرو کہ خدا کیا ہے؟ یہ انسانوں کے بچے نہ کوئی بولی سمجھتے تھے اور نہ کوئی زبان بولتے تھے۔ وہ آدھے وحشی تھے۔ ان کے پاس نہ خدا کا تصور تھا اور نہ سماج کا لحاظ اور خیال۔ وہ دراصل جانور تھے۔ اس تجربہ سے اس نے یہ ظاہر کیا کہ خدا پر ایمان لانا اختیاری ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا تجربہ تھا جس سے اکبر کے اصلی مذہب کی راہ پر دلی اور ذہنی کاوشوں کا اندازہ لگتا ہے۔

اکبر عبادت خانے میں جہاں مذہبی دنیا کے لوگ اکٹھا کئے جاتے تھے ایک تحقیقی فضا صلح کل اصولوں پر پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ ایک مذہبی فرقہ دوسرے مذہبی فرقے کو رواداری اور انسانی نظر سے دیکھے اور سمجھے کیونکہ مذہبی دنیاؤں کا اتحاد دراصل انسانی اتحاد کا پیش خیمہ ہے۔ یہی نظریہ اکبر کا تھا، لیکن اس کو یہ دیکھ کر بے حد رنج ہوتا تھا کہ مذہب جو دنیا میں زندگی کے امن کو قائم کرنے آیا ہے وہی زندگی کی امن پسند دنیاؤں کو کھوکھلا کر کے برباد کر رہا ہے۔ اکبر کا صلح کل سندیہ ایک پرامن مذہب کا اصول تھا جو انسانوں کی برادریوں کو آپس میں محبت اور اتحاد کے رشتہ میں جوڑتا ہے۔

اکبر کا دین الٰہی "صلح کل اصول کا لازمی نتیجہ تھا۔ وہ مذہبوں کے نچوڑ یا ان کے اصل کی تلاش میں انسانی جستجو کی ایک زندہ نظیر تھی۔ عام خیال ہے کہ اکبر نے دین الٰہی کے ذریعہ ایک نیا مذہب قائم کیا۔" دین الٰہی" اس اعتبار سے نیا مذہب تصور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مختلف

Marfat.com

مذہبوں کا مجموعہ تھا۔ اکبر تمام مذہبوں کی اصل کو ایک مانتا تھا۔ اس لئے اس نے ان کے موٹے موٹے اصولوں کو دین الٰہی میں جمع کیا تاکہ انسان مذہبوں کی ظاہر پرستیوں کے فرق کو بھول کر اصلی مذہب کے آسان دینی اصولوں پر یقین لائے اور اپنی زندگی کو رواداری اور یکرنگت کا نمونہ بنائے۔ یہ سچ ہے کہ اکبر کا دین الٰہی دھرم کی حیثیت سے پھیل نہ سکا لیکن جس جذبے کے تحت اس نے اکبر کے دل و دماغ میں جنم لیا وہ مذہب کا کوئی انوکھا روپ نہ تھا بلکہ مذہبی جستجو کی اسپرٹ تھی جو سچائی اور حق کے راستے پر کھوج لگا رہی تھی۔ "دین الٰہی" اکبر کی امن پسند ذہنیت اور خیالوں کی پیداوار تھی۔ گو "دین الٰہی" عام نہ ہو سکا لیکن اکبر کی کلچرل زندگی میں اس کا نمایاں حصہ تھا۔ اس نے عملی طور پر اپنی زندگی میں اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ مذہبی دنیا کا ایک سچا نمائندہ ہے جو ہر مذہب کے اصول اور عقیدے کو اپنی زندگی کا جز قرار دیتا تھا۔ اس کی زندگی مذہبوں کے احکام کی مرکز تھی۔ دوسرے لفظوں میں اکبر کی شاہی انسانوں کی مختلف برادریوں کو ملانے میں کامیاب ہوئی۔ غیریت اور اپنائیت کے فرق کو جو حاکم اور محکوم پایا جاتا اور دنیا میں مسلسل مذہب اور تہذیب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اکبر نے اپنے صلح کل اصول سے مٹا دیا۔ جس طرح اشوک نے ایک گہری راج انسانی اصولوں پر قائم کیا تھا ویسا ہی اکبر نے بھی ایک راج قائم کیا۔ لہٰذا عہد وسطیٰ میں اشوک نے دوبارہ اکبر کی شکل میں جنم لے کر پرانے ہندوستان کو

Marfat.com

نئے روپ میں ڈھالا۔ اکبر کا سب سے اہم ترین کارنامہ ہندوستان کی تاریخ میں یہی تھا۔

اکبر کا کلچری مشن محض انسان اور سماج کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ اس کا اثر راج نیتی پر بھی پڑا۔ ایک راج سیوک کی حیثیت میں اس کی راج نیتی بھی نرالی تھی۔ وہ محض فوجی مہموں پر مبنی نہ تھی۔ جس طرح کلچری یکتائی کے مسلک کو اس نے پورا کیا اسی طرح وہ سیاسی یکتائی کے منصوبہ میں بھی پورا اترا۔ سیاسی یکتائی اس وقت تک اپنی مکمل شکل کو نہیں نکھار سکے گی جب تک کہ ملک کے سیاسی حصے یا قومیں ایک سنہرے عالمگیر جہانبانی کے رشتے میں منسلک نہ ہوں سیاسی یکتائی کا سوال محض انتظامی حکمرانی کا نہیں بلکہ کلچر کا ہے۔ راج نیتی اور کلچر کے آپس کے تعلق کو راج کی ترقی کے لیے لازم سمجھیں۔ اکبر کا ہندوستان اعظم ان ہی اصولوں سے نگ بھاگ بنایا گیا تھا۔ ہندستان اعظم اکبر کی نگاہ میں صرف ایک خیالی دنیا نہیں تھی بلکہ اس کو وہ حقیقت سمجھتا تھا کیونکہ ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے سنگھٹن کو ایک مرکز پر لانے کے لیے نئی فضا کی ضرورت تھی۔ وہ اپنی مقامی ملکی تاریخ، روایات اور دستور کو فخر کی نظر سے دیکھتے اور ہندوستان اعظم کی بڑھتی ہوئی قوتوں میں رکاوٹ بنتے تھے۔ رجواڑوں میں مرکزی ہم آہنگی اور سنگھٹن کا خیال اور جذبہ مطلق نہیں تھا۔ اکبر کی یہ کوششیں کہ دیسی رجواڑوں سے تعلقات گہرے اور دیرپا سمبندھ پیدا کیے جائیں ہندستان اعظم

ملک کو قریب تر لانے میں مدد دی۔ ہندوستانی رجواڑی
لوگوں کو ملائے بغیر ہندوستان کو ہندوستانِ اعظم نہیں بنایا جا سکتا
اور اسی کی ترقی ہے۔ اس میں رکاوٹوں کے معنی یہ ہوں گے کہ ہندوستان
ہمیشہ کے لیے ایک جھگڑوں کا گھر رہے گا۔ اکبر نے ان جھگڑوں اور بغض
کو اس نے اتحاد اور محبت کے قانون سے بدل ڈالا۔ گویا دنیا کے لیے یہ
قانون ہے۔ اکبر کے رجواڑی شادی بیاہ کے رشتے اسی مسلک کی
طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس کلچری میل ملاپ کا اثر اس قدر گہرا ہوا
کہ تھوڑے ہی عرصہ میں رجواڑے اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس
کرنے لگے اور ان پر مغلی ہندی جذبات اور ذہنیت کا پرتو پڑنے
لگا۔ اس آپس میں ملاپ سے یہ نتیجہ نکلا کہ مغلوں کے دل و دماغ
پر رجواڑی زندگی کا اثر نظر آنے لگا۔ ہندوستان کی تاریخ کا یہ
پہلا زمانہ تھا جب کہ ملک کی کلچری قوتوں کے میل سے ایک نئی
امن پھیلانے والی تہذیب پیدا ہوئی۔ اس راج نے ملک اور قوم کی
میل جول، اتحاد اور محبت کے بڑھانے اور پھیلانے میں رجواڑی
قوتوں نے خوشی سے ہاتھ بٹایا۔ اکبر سے لے کر اورنگ زیب تک
فوجیں رجواڑی کمان کے تحت مغلوں کے لیے وفاداری سے
لڑتی رہیں جن کی شہادت ہمیں اس زمانہ کی تاریخ میں ملتی ہے۔ راجپوتی
فوجوں کی بھرتی کا سلسلہ اکبر سے اٹھا اور اورنگ زیب کے عہد تک
بڑھتا گیا۔ یہاں اس امر کا ذکر کرنا بے حد مناسب ہے کہ مغلوں سے

Marfat.com

پہلے بھی مسلمان حکمرانوں کے زمانہ میں تقریباً جتنی بھی لڑائیاں ہوئیں وہ محض مسلمان فوجوں اور ہندی فوجوں کی آپس کی مڈبھیڑیں نہیں تھیں مسلمان حکمرانوں کے ساتھ ملکی ہندی رجواڑوں کی ہندی اور مسلمانوں ملواں فوجیں جو تھیں وہ ہندی یا مسلمان رجواڑوں کے خلاف ڈٹ کر لڑیں مسلمانی حکومت کے استحکام میں ہندی فوجوں کی قربانی اور وفاداری اسی طرح مسلم ہے جس طرح کہ مسلم فوجوں کی تھی۔ جیسے جیسے مسلمانی راج میں پائیداری پیدا ہوتی گئی ویسے ویسے ملواں فوجیں حکومت کی خصوصیت بنتی گئیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں شاید ہی ایسی مثالیں ملیں جہاں مسلمان اور ہندی دو گروہ یا لوگ ہو کر ایک دوسرے کے خلاف لڑے ہوں۔ ہندو مسلمان فوجوں کی ہار اور جیت دراصل حکومت کی ہار اور جیت کا سوال تھا مسلمان حکمراں ہندوؤں کو کمان سپرد کرنے میں کبھی پیچھے نہیں رہے مسلمان حکومت نے جو لڑائیاں ملواں فوجوں سے ہندو یا مسلمان حکومتوں کے خلاف لڑیں وہ مذہبی جذبے کے تحت نہیں ہوئیں۔ وہ لڑائیاں دراصل ملک گیری کی ہوس میں ہوئیں یعنی مسلمان مسلمان حکمرانوں کے درمیان یا مسلمان اور ہندو حکمرانوں کے درمیان سیاسی لڑائیاں ہوتی رہیں تاکہ ملک پر اپنا قبضہ ہو۔ ایک عالمگیر اسلامی راج کے قیام کے منصوبے نہ چھوٹے مسلمان حکمرانوں کے پیش نظر تھے اور نہ بڑے حکمرانوں میں پائے گئے تھے، بلکہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ

Marfat.com

بڑی مسلمان سیاسی قوتیں چھوٹی مسلمان حکومتوں کو برباد کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ ان ریاست کاریوں میں نہ اسلام کی جھلک تھی نہ دین کی سیوا کا خیال، نہ اسلامی برادری کا جذبہ اور نہ "امت" کو مضبوط بنانے کی کوشش۔ لڑائیوں کے ڈھنگ اور طریقوں سے جو نتیجہ نکلتا ہے کہ ملک کے حصوں کو ایک طاقتور حکومت کے تحت لایا جائے۔ یہ تھیں ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی نام نہاد اسلامی "خدمات" اور "کارگزاریاں"۔ ایسے ہی واقعات مغل زمانہ میں بھی دہرائے گئے جہاں عام فوجی بھرتی میں مذہبی عنصر کا دخل نہ تھا بلکہ حسب نسب کا پاس اور لحاظ تھا وہ طبقوں کی نسبت جانبداری اور وفاداری تھی۔

اکبری دور سے سیاسی رجحانوں کے ذریعہ کھلی ہوئی فکری زندگی کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کیونکہ راجہ کے سامنے انسان کے مرتبہ کی جانچ میں اس کا مذہب کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اکبری دور نے ریاست کی بنیاد غیر مذہبی اصولوں پر رکھ کر اس فرق کو دور کیا جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان جذبہ کی وجہ سے پیدا ہو رہا تھا اور غیر مسلموں کو جہاں بادشاہ اس کا اختیاری فعل تھا اور حکومت کا دیا ہوا مذہبی عقیدہ سے کوئی واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ اس زمانہ کی دنیا کے مذہبی آزادی کا خیال ایک حیرت کی بات تھی۔ اکبر کی تعلیمات کا نچوڑ (جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں) عام زندگی کو امن پسند اصولوں پر چلانا تھا۔ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ زندگی کا امن پسند اصول

اس وقت تک اپنے مقصد کو نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ انسان کو مذہبی وچار اور عمل میں آزادی نہ ہو۔ مذہبی آزادی پیش خیمہ ہے انسانی زندگی کے ایک پہلو کی ترقی کا۔ ایسا ممکن ہے کہ اکبر بھی انہی خیالوں اور جذبوں سے متاثر ہو کر کل مذہبی آزادی کا پرچارک بنا۔ راج پاٹ کو مذہبی دباؤ اور اثر سے آزاد ہی نہیں کیا بلکہ یہ ظاہر کیا کہ راج پاٹ کا تعلق سرکار سے اور مذہب کا انسانوں کے دل سے۔ لیکن مذہبی آزادی کی حفاظت کا سوال سرکار کا سوال ہے کیونکہ انسانوں کو بلا روک ٹوک مذہب پہ چلنے کی آزادی سرکار کی حفاظت ہی سے حاصل ہو سکتی ہے اس لحاظ سے جس راج کی عمارت اکبر نے تیار کر کے کھڑی کی تھی اس کی بنیادوں میں نہ مذہب کا قانون تھا اور نہ مذہب کا عنصر۔ وہ بالکل غیر مذہبی تھی یا مذہب سے آزاد۔ اس ضمن میں اگر یہ کہا جائے کہ اکبری راج کلچری مگر غیر دینی اصولوں پہ قائم تھا تو غلط نہ ہوگا۔

مغلیہ عہد کا دوسرا دور جہانگیر کے راج سے شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر اپنے باپ کے قدم پہ اس طرح چلا کہ جو مقبولیت اور ترقی اکبری اصولوں کو حاصل ہو چکی تھی ان میں رخنہ اندازی اور رکاوٹ کی بجائے اور زیادہ ترقی تیزی سے ہونے لگی۔ جہانگیر نے "تزک جہانگیری" میں اپنی کل ہستی کے مختلف روپوں کو پیش ہی نہیں کیا بلکہ ایسے خوش عقیدہ کا اظہار کیا کہ وہ اپنے باپ کے اعلیٰ اصولوں کا حامل دکھائی دیا۔ اس لحاظ سے جہانگیر کا دور اکبری عہد کے سلسلہ کی کڑی ہے جو اس کے

Marfat.com

ہاتھوں مضبوط ہوئی۔ جہانگیری دور کی پکار جو دنیا نے سُنی وہ انصاف
کی پکار تھی۔ انصاف جہانگیری نقطۂ نظر سے ایک ایسا انسانی اصول
ہے جو زندگی کے امن کی دھاروں کو ایک سنگم پہ لاتا ہے۔ انصاف
پُرامن زندگی کی جان ہے۔ اکبری عہد میں صلحِ کُل مسلک کو جو پھیلاؤ
نصیب ہوا اسے جہانگیری عہد میں گہرائی حاصل ہوئی۔ جہانگیری انصاف
ایک محدود دائرہ میں نہیں پنپا بلکہ وہ ایک جہانی قوت کی حیثیت میں
ہر انسان کی حفاظت کرنے کے لئے آیا تھا۔ اس کا تعلق کسی جماعت،
کسی فرقہ، کسی ذات اور کسی مذہب سے نہ تھا۔ جہانگیری انصاف
دراصل انسانوں کے ساتھ بالا لحاظ رنگ و روپ اور مذہب ایک غیر
دینی اور غیر سیاسی انصاف تھا۔ وہ ایک قانون تھا جو انسان کے
دل میں انسان کے ساتھ انصاف کے لیے پیدا ہوا تھا۔ اس کا مسلک
انسانی تھا یعنی انسانی حفاظت، انسانی ترقی اور انسانی حق۔ جہانگیر
کی شخصیت کا مطالعہ اگر گہری نظر سے کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
وہ ایک بہت بڑا انسان تھا اور اس کی زندگی کی اچھائیاں اور
برائیاں جو اس میں تھیں مرتے دم تک تھیں، انسانی قانون کی آواز کو بلند
کرنے میں کامیاب ہوئی۔ مغل حکمرانوں کی شخصیتوں میں جو انسانی قوتیں
ابھری ہوئی تھیں ان میں سے جہانگیر کی شخصیت کو سب سے زیادہ والہانہ
حیثیت ایک انسان کی حاصل ہوا۔ اس کی تمام دلچسپیاں چاہے
وہ تاریخی ہوں یا مذہبی، یا سائنسی ہوں یا نیچری یا فنونِ دستکاری کی ہوں یہ

ظاہر کرتی ہیں کہ جہانگیری انسان نے جیسے جیسے ترقی کی ویسے ویسے اس کے کاموں میں حق کی تلاش کی امنگوں سے ایک دلکش تکنیک، ایک نیچر کا پریمی، ایک سائنس داں، ایک عشرت پسند مگر زندہ انسان ایک فن داں اور ایک انصاف پسند بادشاہ پیدا ہوا۔

شاہجہانی راج مغل عہد کی شان و شوکت تھی۔ گو شاہجہاں کے دور میں اکبری اور جہانگیری جہتیں اور روایتیں ترقی پر تھیں لیکن یہ دور اپنی نوعیت کے اعتبار سے شاہجہانی مسلک کا نمونہ تھا۔ شاہجہاں کی حسن پسندی اور تعمیری قوتوں کو ابھارنے کے لیے اس کی طبیعت میں شائستگی اور نفاست پیدا ہی نہیں کی بلکہ اس کے راج پر اپنی چھاپ ڈال دی۔ ہندوستانی زندگی کا ہر شعبہ شاہی صفتوں میں رنگ گیا۔ کل ملک میں نیا شاہجہانی رنگ چڑھنے لگا۔ شاہجہاں کا زمانہ دراصل مغل عروج کا زمانہ تھا جس میں سیاسی، سرکاری، انتظامی، سماجی، صنعتی اور فنی ترقی اپنے آخری منزل کو پہنچی اور مغل شیرازے کے تانے بانے مضبوط کر دیے گئے۔ شاہجہانی ہندوستان پر انسانیت کا پرتو اس طرح پڑا تھا کہ عام زندگی کے تہذیبی معیاروں اور اظہاروں میں شاہجہانی جھلک نمودار ہوئی۔ شائستگی اور نفاست کے پرچار کی وجہ سے انسان کی زندگی میں جمالیاتی اور خوشگوار اثرات ظاہر ہوئے۔ شاہجہاں کی فنی یادگاریں آج بھی یہ بتاتی ہیں کہ کلچر اور آرٹ کا میل انتہائی کمال کو پہنچ گیا تھا جس کے باعث ہندوستان کی شہرت

Marfat.com

دنیا میں ہوئی۔ فنی اور کلچری قوتیں محض انسانی تخیل اور فکر کی نظریں
نہیں ہیں بلکہ زندگی کے مختلف موڈ، روپ کے مظاہرے ہیں۔
اس لحاظ سے شاہجہانی راج ایک زندہ سماجیاتی پس منظر میں اپنے
نفسیاتی، جمالیاتی اور تہذیبی مسلک کو پیدا کرتا ہے۔ شاہجہانی مسلک
کی کامیابی کا بھید ہندوستانی دنیا کی قوتیں تھیں۔ ہندوستان کے
سینکڑوں برسوں کی تہذیبی روایات اور فنی تجربہ جو یہاں شاہجہاں کے
کے کام آئیں۔ شاہجہاں کا تہذیبی اور فنی مسلک اس وجہ سے پیدا ہوا
کہ اس نے ملک کی سمجھ، فکر اور عمل کے ذخیرے سے استفادہ کیا۔ اس
طرح شاہجہانی ہندوستان "بابری حکم" کے مطابق تہذیبی اور جمالیاتی
ترقی کرتا ہے۔

کلچر اور آرٹ اسی ملک میں پروان چڑھ سکتے ہیں جہاں امن
کے ساتھ ساتھ انسان خوشحال اور اطمینان بخش زندگی بسر کرتے ہوں۔
شاہجہانی دور میں یہی نہیں ہوا کہ دلی ایک کل ہند کلچر اور آرٹ کا
مرکز بنا بلکہ ہندوستان کے ہر حصے میں جہاں جہاں تہذیب اور آرٹ
کو دور دور تک ترقیاں دکھائی دیتی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ مرکز
نے ان رجحانوں کو ایک وسیع پیمانہ پر اور اعلیٰ معیار تک پہنچایا۔ مغل
شہادتیں اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ ملک میں اشیا کی افراط تھی۔
لوگ آسانی سے اپنی ضرورتوں کو پورا کر سکتے تھے اور ضرورت کی تمام
چیزیں سستی تھیں۔ عام زندگی کے لوازمات آسانی کے ساتھ فراہم

Marfat.com

ہو جاتے تھے مغل دور کا تیسرا پہلو غیر مغلی تہذیب کا مرکز بنا کیونکہ اس زمانہ میں مغلوں کے کلچری روایات جو تیزی سے ملک میں پھیل رہے تھے اور جن کی وجہ سے ہندوستان کی تمام زندگی میں تبدیلی بھی ہو رہی تھی اس کے خلاف ایک بد نما ردعمل پیدا ہوتا ہوا نظر آیا۔ وہ خلاف مغلیہ ردعمل ہے جو اورنگ زیب کے دور حکومت سے شروع ہوا۔ اورنگ زیب کے راج کے متعلق تاریخ لکھنے والوں نے دو ایسے نظریوں کو پیش کیا ہے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ ہندی اسکول کا کہنا یہ ہے کہ اورنگ زیب ایک متعصب مسلمان بادشاہ گزرا ہے جس کو ملک والوں کی تہذیب سے نفرت تھی اور وہ اس ملک میں ہندی اداروں کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ دوسرا نظریہ ان مسلمان تاریخ لکھنے والوں کا ہے جو اس کو ایک آئیڈیل مسلمان بادشاہ تصور کرتے ہیں جس کا مسلک ہندوستان میں اصلی اسلامی راج قایم کرنا تھا۔ اورنگ زیب بحیثیت ایک مسلمان بادشاہ کے ان کی نظر میں قابل تعریف ہے۔ ان نظریوں کے باعث اورنگ زیب کی شخصیت اور کارنامہ سے متعلق بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں اور ان کا سلجھانا دشوار سا نظر آتا ہے کیونکہ عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کے حالات محض ہندو یا مسلم فرقہ واریت کے اصول سے جانچنے کے معنی یہ ہوں گے کہ تاریخ کا صحیح اندازہ نہ لگ سکے گا۔ اورنگ زیب ہندو کا دشمن اور مسلمان کا سرپرست اگر تھا تو اس کے زمانہ کی تاریخ ہمیں ایک دوسری کہانی سناتی ہے۔ یہ بالکل

صحیح ہے کہ اس کے زمانہ میں حکومت کی جانب سے یا بادشاہ کے احکام سے اپنے خلاف ہندو کام ہوئے جس سے انصاف فوری اس نتیجہ پر آتا ہے کہ وہ ان کا دشمن تھا۔ لیکن اسی کے ساتھ اس زمانے کی ہندو پرست شہادتیں بھی ایسی ملتی ہیں جس سے اس بات کا صاف اندازہ لگتا ہے کہ وہ روادار تھا۔ اورنگ زیب کے عہد کو دو بڑے حصوں میں اگر تقسیم کیا جائے تو اس کے متعلق صحیح رائے قائم ہو سکے گی۔

اورنگ زیب کے پہلے بارہ سال کا دور دراصل مغلیہ روایات کا وہ سلسلہ تھا جس میں اورنگ زیب نے مغل راج کے دستور اور طریقوں کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ اسی عہد میں اس نے رواداری کے اصولوں کو حکمرانی میں برتا۔ اورنگ زیب کا دوسرا دور بارہ سال کے بعد شروع ہوا جب کہ اس پر علماء کا اثر ظاہر ہونے لگا۔ اورنگ زیب کے راج کا یہ پہلو آخر وقت تک قائم رہا۔ اس دور میں اورنگ زیب نے اپنے راج کی فضا میں تبدیلی اور گہری تبدیلی پیدا کی۔ اس کی یہ کوشش رہی کہ وہ مغل راج کو اسلامی راج میں تبدیل کرے اور اس بات کا اس نے اعلان بھی کیا کہ وہ قانون اسلام کا پابند ہوتے ہوئے حکومت کرنا چاہتا ہے۔ اورنگ زیب کو اس ملک کے عملی جامہ پہنانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب آسانی سے نہیں دیا جاسکتا کیونکہ [illegible] سے دراصل اورنگ زیب کے خلاف تاریخ لکھنے والوں نے اپنے اپنے تاثرات یا رائیں پیش کی ہیں

Marfat.com

جو ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ محض خیالوں کی تائید یا مخالفت اورنگ زیب کے جانچنے میں ایک حقدار کی مدد نہیں کرتے۔ اورنگ زیب کو اگر جانچنے کی کوشش کی جائے تو اس کو اسی کے معیاروں سے جانچا جا سکتا ہے اور پھر اس کی شخصیت اور اس کے خیالوں کو عمل کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کریں گے۔ اگر اورنگ زیب نے مغل راج کو تبدیل کر کے ایک اسلامی راج ملک میں قائم کیا تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زمانے کی مصلحت کے اعتبار سے ایک صحیح عمل تھا یا راج نیتک اصولوں کے اعتبار سے اپنے میں واجبیت رکھتا تھا یا وہ محض ایک انسان کا خیال تھا جس کو اورنگ زیب پورا کرنا چاہتا تھا یا علماء کے دباؤ کا نتیجہ تھا جس سے اورنگ زیب مرعوب ہو کر اسلامی حکمرانی کی داغ بیل ڈالنا چاہتا تھا۔

مغل تاریخ پر ایک سرسری نظر جو اب تک ہم نے ڈالی اس سے یہ ظاہر ہوا کہ مغل راج کی بنیادیں مغل طرز ذہنیت اور جذبوں کی بنا پر مضبوط تر ہوتی جا رہی تھیں۔ مغل اثر نے ملک کو اپنا لینے میں انتہائی کامیابی حاصل کی تھی۔ مغل راج اپنے میں سے غیریت کے عنصر کو نکال کر ملک کے سانچے میں ڈھال چکا تھا۔ راج اور رعایا میں یگانگت کے رشتے جڑ گئے تھے۔ مغل راج ایک دیسی راج سمجھا جانے لگا تھا۔ رعایا میں ہندو اور مسلمان کے فرق کو ایسا مٹا دیا گیا تھا کہ حکومت سب کو ایک ہی نظر سے دیکھتی تھی اور اپنا ہی سمجھتی تھی۔ خصوصاً اکبر کے

سیکولر اصولوں نے جو خیالی اور عملی کا نظام قائم کیا تھا۔ اس سے ملک میں نئی فضا، نئی طبیعت، نئی امید، نئی مسرت اور نیا میل ملاپ پیدا ہو چکا تھا۔ ایسے حالات میں جب کہ تہذیبی یکتائی مغل راج کی خصوصیت بن رہی تھی تو اورنگ زیب کا یہ فعل کہ وہ حکومت کی جڑوں کو کھوکھلا کرے اور عوام کی زندگی میں بے یکجہتی، دشمنائی اور خلش پیدا کرے مصلحت کے سراسر خلاف تھا۔

راج نیتک اصولوں کے اعتبار سے اورنگ زیب کی نئی حکومت کی بنیاد جو اس نے اسلامی اصولوں پر رکھی زمانہ کے لحاظ سے اس کی غیر شعوری کوتاہ نظری کو ظاہر کرتی ہے کیونکہ اکبر اعظم کو وہ تخیل کہ ہندوستان کو ایک ہندوستان اعظم میں تبدیل کیا جائے اورنگ زیب کے اس نظریہ سے ٹکراتا ہے اور ملک میں خلاف مرکزی اصولوں اور رجحانوں کو ترقی دیتا ہے۔ ہندوستان کے چھوٹے اور بڑے رجواڑے یہ سب کے سب ہندوستان اعظم کے دائرہ میں اپنے کو محفوظ اور مضبوط سمجھتے تھے۔ اس طرح ملک میں ایک نئی سیاسی فضا رفتہ رفتہ پیدا ہوتی گئی جس نے ہندوستان اعظم کے خیال کے پھیلانے میں مدد پہنچائی۔ اورنگ زیب کے اسلامی راج کا تخیل ہندوستان اعظم کی ترقی میں نہ صرف رکاوٹ ہی بنا بلکہ اس کے انتشار کا باعث بھی ہوا۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایک سلجھا ہوا مدبر یا سیاستدان ہوتا تو وہ اپنے راج کو اس طرح زوال پذیر نہ ہونے دیتا۔ اورنگ زیب

Marfat.com

کا اسلامی راج اگر ایک انسان کے جنون کی پیداوار تھی یا علماء کے دباؤ اور اثر کا نتیجہ تھا تو ہم یہ کہیں گے کہ اورنگ زیب کا کوئی ذاتی اصول نہ تھا اور نہ اس کی کوئی اپنی رائے تھی لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ جو شہادتیں اورنگ زیب کے زمانہ کی ملتی ہیں ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اورنگ زیب ایک اصولی آدمی تھا، لیکن وہ اس بات کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا کہ زمانہ کے لحاظ سے کہاں تک اس کے اصول اپنے میں جاذبیت، کشش اور کامیاب ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ محض علماء سے متاثر ہوا بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اورنگ زیب کی طبیعت میں شروع ہی سے مذہبی فکر اور سنجیدگی تھی اور اپنی زندگی کو اس نے مذہبی رنگ میں ڈھالا تھا۔ شروع شروع میں مغلیہ روایات اس پر حاوی تھے مگر مغلیہ رنگ کے پھیکے پڑ جانے سے اس کی اصلی شخصیت نمایاں ہوئی۔ جیسے جیسے اس میں مغل ذہنیت کا اثر کم ہوتا گیا ویسے ویسے اورنگ زیب کی شخصیت میں اسلامیت کا رنگ چڑھتا گیا اور اس کی شخصیت علماء کے اثر کو قبول کرنے لگی یعنی اورنگ زیب کے خیال کو علماء کی جماعت سے تقویت پہنچی اور وہ اپنے منصوبوں کو پورا کر سکا۔ فطرتاً اورنگ زیب ایک روکھا پھیکا اور خشک انسان تھا۔ اس کی زندگی ہمیشہ سے ایک تپسوی کی سی تھی۔ گو مغل زندہ دل اور دنیا دار انسان تھے لیکن اورنگ زیب ایک پیا انسان

تھا جو اپنی زندگی کو اصولوں کے سانچے میں جکڑ کر اپنے کو تپش کی آگ
میں جلاتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے اصولوں میں نہ جنبش تھی نہ حرکت
اور لچک جس طرح اس نے اپنی زندگی کے ساتھ سختی اور [illegible]
برتی اسی طرح اس نے دنیا کے ساتھ اصولوں کو پیش نظر رکھ کر برتا۔ جہاں
حکمرانی کو وہ ایک سخت اصول اور کڑی تنظیم سمجھتا تھا [illegible] اور
حق کی پابند تھی اور اسلام کا قانون حکمرانی کی [illegible] اصول۔
اورنگ زیب کی شخصی اور حکمرانی زندگی ان [illegible] اصولوں اور نظریوں کے
تابع تھی۔ اورنگ زیب کا یقین تھا کہ خدا نے اس کو وہ تمام صلاحیتیں
بخشی ہیں جو ایک سچے مسلمان حاکم میں ہوتی ہیں اور اس کو حکومت
کرنے کے لیے بھیجا ہے۔ حکومت ایک امانت ہے جو خدا نے
اورنگ زیب کو دی تھی جس کی نگرانی، حفاظت اور ترقی کی ذمہ داری
اس پر عائد ہوتی ہے۔ خدا کا حکم اورنگ زیب کے نقطہ نظر سے قانون
اسلام کا حکم تھا۔ اس قانون کو کامیاب بنانے میں اورنگ زیب کوشش
کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی نظر میں دو گروہ میں یعنی مسلمان اور
ذمی میں تقسیم کیے گئے۔ اس کے زمانہ کی شہادت یہ بتاتی ہے کہ غیر
مسلمانوں پر جزیہ نافذ کیا گیا لیکن تاریخ کی شہادت سے یہ معلوم نہیں
ہو سکا کہ آیا واقعی کل غیر مسلم رعایا سے جزیہ لیا گیا یا نہیں اگر
اتفاق [illegible] تھا۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ اورنگ زیب نے غیر مسلم
[illegible]
[illegible] تھی [illegible]

Marfat.com

اورنگ زیب پر یہ واجب تھا کہ وہ ان کی جان و مال اور ان کے
مقدس مقاموں کی حفاظت اور نگرانی کرے لیکن تاریخ ان واقعات
سے بھری پڑی ہے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ
میں غیر مسلم رعایا کے ساتھ قانون اسلام کی رو سے انصاف نہیں
کیا گیا۔ اورنگ زیب کی حکومت کو یہ حق نہ تھا کہ ہندوؤں کے
مندروں کو ہاتھ لگائے اور ان کو مسمار کرے۔ اگر مندر مسمار کیے
گئے تو اورنگ زیب کی اسلامی حکومت زیر تبصرہ لینے کے بعد اپنے
اسلامی قانون کی حفاظت انہیں قرار دے سکتی بلکہ اس پر اسلامی نقطہ
نظر سے مندروں کے توڑنے کا الزام عائد ہوتا ہے، کیونکہ حکومت
قانون اسلام کی پابند تھی۔ مندروں کی مسماری کا سوال ایک اسلامی
قانون کی خلاف ورزی کا سوال ہے۔ اورنگ زیب کے حکم سے
مندروں کے توڑنے کی تحریک اسلامی قانون کی مخالفت کرتی ہے
اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اپنی غیر شرعی حرکت کے خلاف
جواب دینا ہوگا۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایک سچا مسلمان تھا اور
قانون اسلام کا پابند تھا تو اس کو ایسی حرکات سے گریز ہی کرنا
چاہیے تھا لیکن یہ ہو نہ سکا۔ لیکن اس کے زمانہ میں اسی کے حکم سے
مندر توڑے گئے تو کیا اورنگ زیب ایک سچے مسلمان بادشاہ
یا ایک متعصب انسان ہونے کی حیثیت میں قانون اسلام کی رو
سے جانچا جا سکتا ہے۔ یا ان مندروں کے توڑ پھوڑ کے سلسلے میں اور

Marfat.com

کوئی سیاسی جذبات کام کر رہے تھے جن کی وجہ سے [illegible]
[illegible] سکتے۔ اس سلسلے میں [illegible]
کرتی ہے۔ ان مندروں کے [illegible]
میں بعض نئے مندر [illegible]
[illegible] اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے [illegible]
[illegible] مندروں کو توڑا اور [illegible]
[illegible] سمجھا [illegible]
اورنگ زیب اسلامی اصولوں پر [illegible]
[illegible]
کیا ہے اس میں [illegible] سے کام لیا گیا ہے [illegible]
مندر مسمار کروائے اسی طرح [illegible]
میں ظاہراً طور پر [illegible] اصولوں کے [illegible]
[illegible] اس میں [illegible] اورنگ زیب [illegible]
[illegible] تحقیق [illegible]
[illegible] ان پہلوؤں پر نظر ڈالیں [illegible]
[illegible] مذہب کا عنصر کہاں تک کام کر رہا تھا اور [illegible]
ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اورنگ زیب [illegible]
[illegible] میں ایک چھپا ہوا سیاست دان بھی چھپا ہوا تھا [illegible]
اپنے کو نمایاں کرتا رہا، لیکن وہ منظر عام پر نہیں لایا گیا۔ اس [illegible]

اور اس کی کارکردگی سے زمانہ اور لوگ متاثر ہوئے۔ عام خیال یہ ہے کہ اورنگ زیب کے مذہبی انسان ہی نے تمام کاموں میں محرک کا کام دیا تھا۔ اس طرح اورنگ زیب کی شخصیت کی گتھی سلجھائی جاتی ہے۔ زمانے کے بعد تاریخ اپنا تصفیہ کیسے کرا اورنگ زیب کیا شرع شریعت کا پابند اسلامی حکمران تھا یا ایک مذہب کا بہروپیا تھا جو ایک سیکھے ہوئے سیاستداں کے روپ میں ظاہر ہوا۔

اورنگ زیب میں تمام مغل حکمرانوں کے مقابلہ میں وہ احساس کہ حکمرانی ایک بڑی ذمہ داری ہے نمایاں طور سے پایا گیا۔ اس کے زمانہ میں جس طرح حکومت کے حدود وسیع تر ہو چکے تھے اسی طرح اس نے حکمرانی کی ذمہ داری کو زیادہ محسوس کیا اور اس بات کی کوشش کی کہ راج پاٹ کے کاروبار انصاف کے اصولوں پر ہوں۔ اورنگ زیب کا سیاسی خیال مرکز کے اصول کے تحت کام کرتا تھا یعنی ایک قوی مرکز کو بنانا اور اس کے ذریعہ ملک میں امن قائم رکھنا اس کا شیوہ تھا لیکن حالات اس تیزی سے بڑھتے جا رہے تھے اور اپنے میں الجھنیں اور پیچیدگیاں پیدا کر رہے تھے کہ ایک طاقتور حاکم کے لیے دشوار تھا کہ وہ پرانی انتظامی حکمرانی کے مشین کے ذریعہ راج پاٹ میں درستی کر سکے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مغل حکومت ایک مضبوط مرکز پر پہنچ چکی تھی لیکن اس میں اندرونی امن پیدا ہوتا ہوا کم دکھائی دیتا ہے۔ حکومت کی اندرونی حالت مقابلتاً بیرونی حالت کے زیادہ

بوسیدہ اور کمزور تھی جس کے دور کرنے میں اورنگ زیب کامیاب نہیں ہوا۔ اورنگ زیب کی ناکامی کا سبب محض مرکزی اصول کی کمزوری ہی نہیں تھی بلکہ اس کی شخصیت بھی ذمہ دار تھی۔ اورنگ زیب کے دور میں سیاسی یکتائی کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ غیر مسلم رعایا کی بے چینی اور ناراضگی بھی مرکزی حکومت کو کمزور کر رہی تھی۔ اورنگ زیب نے اس بات کی کوشش نہیں کی کہ وہ ان اندرونی اسباب کو دور کرے جو آگے چل کر مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنتے ہیں۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اورنگ زیب حکمرانی کے اصولوں کو کامیاب بنانے میں بڑی حد تک رہا اور اس کام کی انجام دہی میں اس کی صلاحیتیں بھی اس کی مدد کو آئیں۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ اورنگ زیب ایک خاص ذہنیت کا انسان تھا اور جس کے اصول زمانہ کا ساتھ نہ دے سکے۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ زمانہ آگے بڑھ چکا ہے اور وہ جن اصولوں پر چل رہا تھا وہ اس کو پیچھے پھینک رہے تھے، لیکن اس کو یقین اپنے اصولوں کی سچائی اور درستی کے متعلق ایسا تھا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوگا۔ اورنگ زیب نے اسلامی نقطۂ نظر سے حکومت کرنے کی کوشش کی لیکن اس اسلامی اصول میں اس کی سیاست کاری بھی پوشیدہ تھی۔ اس کے کاموں میں جہاں اسلامی جھلک نظر آتی تھی وہاں راج نیتک اصول

Marfat.com

بھی کار فرما تھے۔ اورنگ زیب کے زمانہ کی تاریخی شہادتوں اور اس کے خطوں سے یہ امر صاف ہو جاتا ہے کہ حکومت کو کامیاب بنانا ایک بہت ہی کٹھن کام ہے۔ اس کے لیے کڑی نگرانی، کھرا انصاف، غیر جانبداری اور تیز فہمی کی ضرورت ہے۔ اورنگ زیب کے خطوط در اصل اس کی شخصیت کی آئینہ داری کرتے ہیں۔ ان کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اورنگ زیب کو کن دشواریوں اور کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے حکومت کے امور سے متعلق کیا کیا خیال ظاہر کیے اور کیا کیا تدبیریں اختیار کیں۔ ان خطوط کی بنا پر ہم اورنگ زیب کی ذہنیت کا خاکہ اس کے خیالوں اور جذباتوں کی روشنی میں پیش کریں گے۔

اورنگ زیب جہانگیری کو شاہی کا مسلک قرار دیتا ہے اور اس یقین کو واضح کرتا ہے کہ جہانگیری کے سلسلہ میں جہانبانی کی ایک مقدم اصول ہے شاہی کا۔ جہانگیری محض ایک خواب یا خیال ہی بن کر رہ جاتی ہے اگر جہانبانی اس کی بنیاد کا کام نہ دے۔ ملک کا فتح کرنا، فوجوں کی تنظیم اور سپہ گری کا سوال ہے۔ لہذا حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ فوجوں کو ایسی حالت میں رکھے کہ وہ اپنی جنگجویانہ صفتوں کو موقع و محل کے لحاظ سے دکھا سکے اور حکومت کے آڑے وقت اپنی کو وفاداری اور نمک حلالی کے

Marfat.com

جذبہ کے تحت قربان ہو جایا کرتے تھے۔ فوجی قوت حکومت کی جان
ہے۔ اسی وجہ سے اورنگ زیب نے فوجی تنظیم کا خاص خیال رکھا
اور ان کی ضروریات کے مطابق ان کو تنخواہ اور مراعات [illegible]
اورنگ زیب کی فوج بہت [illegible] تھا [illegible] مغلیہ
حکومت [illegible] ہندوستان [illegible] کا
[illegible] اور اس [illegible] حکومت
کی عظمت [illegible] پائی [illegible]
[illegible] اورنگ زیب کے [illegible]
[illegible] ان [illegible]
کو حکومت کے حصول [illegible]
کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ [illegible]
[illegible] ان کا [illegible] حکومت
کے [illegible] اورنگ زیب [illegible]
[illegible] کو [illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible]
[illegible] کی [illegible]
[illegible] نہیں
[illegible] کا حصول [illegible]

ریت لیسے حکمرانی مسئلے تھے جن کی گتھیوں میں اورنگ زیب پھنس کر کبھی نکلا اور کبھی نہیں۔ اس کے خطوں میں ایک آواز جو الٹ پھیر کر سنائی دی وہ یہ کہ ظلم کسی شکل میں ہو روا نہیں رکھا جا سکتا۔ ظلم کی مار ایک دھائی ہے جو حکومت کو ختم کر دے گی اور عاقبت میں بھی اس سے نجات نہیں مل سکتی۔ لہذا اورنگ زیب نے جب کبھی بھی ظلم ہوتے ہوئے دیکھا یا سنا یا اس کے کانوں تک اس کی آواز پہنچی تو اس نے بالحاظ مذہب و ملت انصاف کو ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کی نظر میں ظلم دور نہیں ہو سکتا جب تک انصاف نہ کیا جائے۔ انصاف سب کے ساتھ ہے۔ اس بات کا لحاظ کئے بغیر کہ انصاف کس کو مل رہا ہے اور انصاف کی وجہ سے کون مارا جا رہا ہے۔ انصاف کی تلوار شاہی سے لے کر ادنیٰ انسان تک اپنا سایہ یا نہ اور یکساں وار کرتی ہے تاکہ اسے اپنا حق ملے۔ اورنگ زیب نے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا کہ حکمرانی امور کی چھان بین بہت ضروری ہے۔ محض جذبات کے بھڑکنے پر یا شخصی تعصب کی بنا پر یا جانب داری کے جذبہ پر یا مکر و فریب یا سازش پر حکومت کو کبھی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ حکومت اگر ایسا کرے تو اس سے برے نتائج پیدا ہوں گے۔ اس کی عزت اور اس کا وقار لوگوں کی نظر میں گر جائے گا اور ملک میں بے چینی اور بد امنی پھیلے گی۔ اورنگ زیب نے اپنے خطوں

Marfat.com

جب کبھی ایسے حالات سے واقفیت حاصل کی تو اس بات کی سخت تاکید اور تنبیہ کی کہ سرکاری کارروائی اٹھنے سے پہلے پوری تحقیق ہو جانی چاہیئے ورنہ حکومت انصاف نہ کر سکے گی اور اس کے بدنام ہونے کا ڈر رہے گا ہمیں ایسی شہادتیں بھی اس کی جانب سے ملتی ہیں جس کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اورنگ زیب نے اپنے مسلم اور غیر مسلم نمک حلال افسروں کے ساتھ انصاف ہی نہیں برتا بلکہ ان کو اعزاز اور مرتبے بھی دیئے۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے ہیں جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان افسروں نے غیر مسلم افسروں کے خلاف اورنگ زیب کے کان بھرے اور اس بات کی کوشش کی کہ ان کو برطرف کرنے کے احکام لیں، لیکن وہ اپنے مالک کو رام نہ کر سکے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اورنگ زیب اپنے افسروں کی وفاداری کے جذبات کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ ایسے موقعوں پر اس کو اس بات کا خیال کبھی نہیں آیا کہ آیا اس کا افسر مسلم ہے یا غیر مسلم۔ وہ افسر کی تعریف میں صرف ایک گن چاہتا تھا یعنی وفاداری اور نمک حلالی یہی اس کی کسوٹی تھی اور اس کسوٹی پر اس نے اپنے زمانہ کے انسانوں کو کسا، چاہے وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے ہاتھوں افسروں نے مار کھائی، جس میں مسلم اور غیر مسلم برابر

Marfat.com

کے شریک تھے۔ اس کو ہمیشہ اس بات کا افسوس اور رنج رہا
کہ اس کے افسروں میں بے وفائی، بدنیتی اور دھوکہ بازی تھی،
گو اس نے ان کی قدرشناسی، ان کی ہمت افزائی اور سرپرستی
اس وجہ سے کی تھی کہ وہ ملک و مالک کے وفادار رہیں
اورنگ زیب کے آخری زمانہ میں ایک ایماندار افسر کا ملنا
تعجب کی بات تھی۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک خط میں
اس بات کا اعتراف کیا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
اس زمانہ کے مسلم اور غیر مسلم سرکاری افسر اس بات کے
کوشاں نہ تھے کہ وہ اورنگ زیب کے اصلاحی مسلک کو
پروان چڑھانے میں مدد دیں بلکہ اس بات کے درپے تھے
کہ سازشوں، مکاریوں اور جعلی بازیوں کے ذریعہ وہ اپنا
بھلا کہاں تک کرتے ہیں۔ اورنگ زیب نے اپنے ایک
خط میں جب کہ وہ زندگی کے آخری لمحے گن رہا تھا اس
بات کا ذکر انتہائی افسوس سے کیا ہے کہ اس کی کل
زندگی ناکام رہی۔ اس کے منصوبے اور ارادے اس
کے ہاتھوں ختم ہو گئے، اس کے افسروں کی بے وفائیاں
اس کی مایوسی کا باعث رہیں۔ اس کے مسلک نے ناکامی
کا منہ دیکھا۔ وہ لکھتا ہے کہ:

"اس کا جسم ہڈی اور پوست ہو چکا ہے۔ اس کے

Marfat.com

کندھوں پہ دنیا کے گناہوں کا بوجھ ہے۔ چاروں طرف اُداسی اور مایوسی چھائی ہوتی ہے۔ دوزخ کی آگ کے خیال سے اس کو ڈر پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ سے درخواست کرتا ہے کہ اس کے گناہ معاف کئے جائیں۔

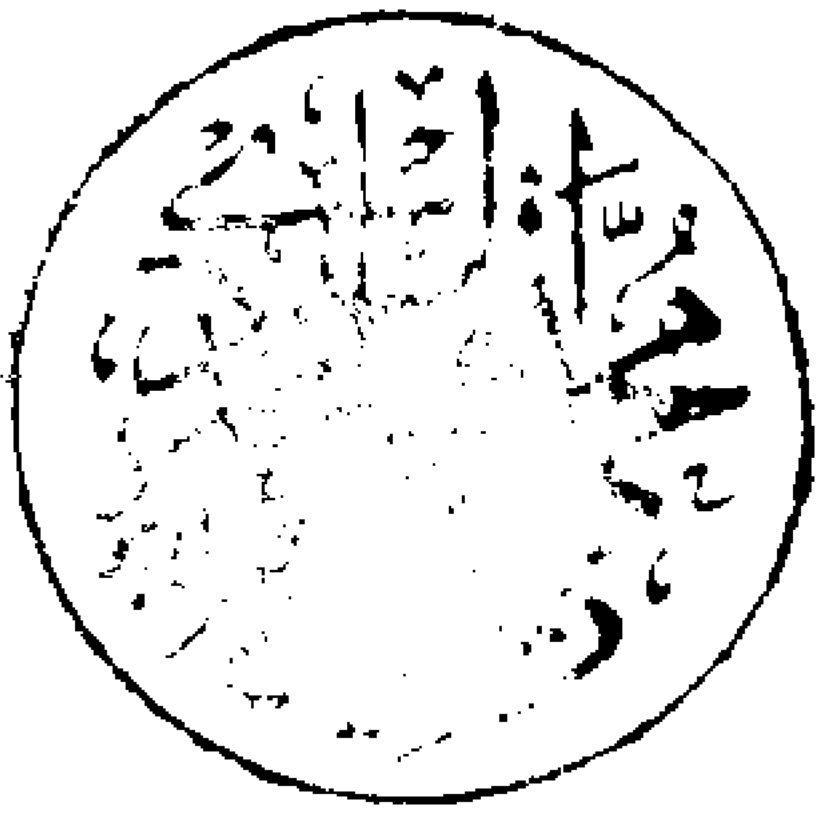

Marfat.com